شہرِ آرزو

(شعری مجموعہ)

باقر مہدی

Rs. 3:50 N.P.

مصنف کا وطن :- ردولی

مستقل قیام :- بمبئی

تعلیم :- فیض آباد - علی گڈھ
لکھنؤ یونیورسٹی
ایم، اے (عمرانیات) ۱۹۵۲ء

پیشہ :- خامہ فرسائی

قیمت :- ~~تین روپے~~

ناشر :- گوشۂ ادب ۲۱ - ارکیڈیا بلڈنگ
بمبئی ۵

اِس شہر میں

اپنی "خیری" کے نام!

دل شکستہ درآں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

یہ میرا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ہے جو میری زندگی میں شائع ہو رہا ہے، شعر میں اب بھی کہتا رہوں گا لیکن شعر کہنا نہ تو میری عادت ہے اور نہ میرا پیشہ —— میں ان دونوں طریقوں کو اچھی شاعری کے لئے مضر سمجھتا ہوں، شاعر کو شمع اور پروانہ، دونوں کی طرح جلنا اور خاکستر ہونا پڑتا ہے تب جاکر چند اچھے شعر تخلیق ہوتے ہیں ممکن ہے کہ "شہرِ آرزو" میں چند شعر اور چند نظمیں انھیں پسند آئیں جو "ذہن بیدار" کے ساتھ ساتھ "دل گداختہ" بھی رکھتے ہیں۔ مصائب اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن غم کی عظمت اس میں ہے کہ آدمی اس کے سہارے آگے بڑھتا جائے۔ جہدِ مسلسل، صبرِ بے پایاں اور عزمِ کامراں کے جذبے نے "شہرِ آرزو" کی تخلیق کی ہے اور مجھے دیوانگی، خودکشی اور غلامی سے بارہا بچایا ہے۔

میرا شعری نظریہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب "شہرِ آرزو" کے مطالعے سے مل سکتا ہے۔

میں اپنے تمام محبوں، دوستوں اور ہمدردوں کا شکرگذار ہوں جنھوں نے اس کی اشاعت میں کسی نہ کسی طریقے سے حصہ لیا ہے۔

باقر مہدی

۱۰۸ - لولین - مجگاؤں
ممبئی ۱۰
۱۱ر جولائی ۱۹۵۸ء

پیش لفظ

انگریزی کی ایک غیر معروف امریکی نوجوان شاعرہ نے اس نسل کی ترجمانی کرتے ہوئے جو حالات سے نا آسودہ ہونے کے باوجود یہ محسوس کرتی ہے کہ اپنی ذات سے روشنی پھیلاتے ہی رہنا چاہیئے اپنی ایک نظم میں یہ مصرعے لکھے ہیں:-

My candle burns at both ends,
It will not last the night;
But ah! my foes and oh! my friends,
It gives a lovely light.

(میں نے اپنی شمع کے دونوں سرے روشن کر دیے ہیں' یہ ایک رات بھی نہیں چلے گی لیکن اے میرے دشمنو! اور اے میرے دوستو! دیکھو تو، یہ کیسی حسین

روشنی دے رہی ہے)

اس نسل کے لوگ کہیں ایک جگہ نہیں، دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ پہلے بھی پائے جاتے تھے لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ایٹم بم کہیں گرے، نہ بھی گرے، لیکن یہ نسل اپنے کو موت کی وادیوں سے گذرتا ہوا محسوس کرتی ہے، یہ حساس نسل اپنے اندر اتنی قوت رکھتی ہے کہ اپنی شمعِ حیات کے دونوں سروں کو جلتا ہوا دیکھ کر اور اس کے ایک رات بھی باقی نہ رہنے کے یقین کے باوجود اس کی خوب صورت روشنی کی طرف اشارہ کر سکتی ہے۔ جب میں باقرؔ مہدی سے ملتا یا ان کے اشعار پڑھتا اور اُن سے تبادلۂ خیال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں یہی نسل آتی ہے، جو روشنی اور تعمیر کی خواہش اپنے سینے میں لئے ہوئے مسلسل اُن موانع سے لڑتی جا رہی ہے جو اسکی راہ میں حائل ہیں۔

باقرؔ مہدی نے اودھ کے قصبہ ردولی میں ۱۹۲۹ء میں ایک خوش حال تعلیم یافتہ اور ادب دوست گھرانے میں جنم لیا۔ اُن کے والد جعفر مہدی صاحب رزمؔ ردولوی اور کئی دوسرے قریبی اعزّا شعر و سخن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ زمینداری، مذہبیت، قدیم و جدید کی آویزش، پاسِ وضع اور آدابِ زندگی کی معیّن اقدار سے باقرؔ مہدی کو جو کچھ ملا، اُس کا بیشتر حصہ اُن کے ذہنی افق کو روشن کرنے کے بجائے ابر آلود بنا رہا تھا۔ اس کش مکش سے متوسط طبقہ کے اکثر نوجوانوں کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اُن کے ذہنوں پر عجیب و غریب اثرات مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ اثرات تخلیقی صلاحیتوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ گھر کی اس فضا کے باہر بھی کش مکش اور آویزش کی ایک فضا تھی۔ عالمگیر جنگ تو جاری ہی تھی عقیدوں اور نظریوں، فلسفوں اور خیالوں کا بھی تصادم کچھ کم نہ تھا۔

بنے بنائے راستے یا تو مٹ چکے تھے یا اس قدر پیچیدہ ہو گئے تھے کہ ہر چند قدم کے بعد انسان کسی دوراہے پر پہونچ جاتا تھا۔ ذہین، حساس اور آزادی پسند انسان کو، جس کی عقل پر جذبہ غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو، یہ راستہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ افتادِ مزاج، خودگری اور خود نگری کا تقاضا کرتی ہے اور حالات کسی دامن سے وابستہ ہو جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ باقر مہدی نے بڑی جرارت سے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا اور اپنی راہ تنہا طے کرنے کی کوشش کی۔ اگر انھوں نے مطالعہ اور خاص کر سماجی علوم کے مطالعہ کا سہارا نہ لیا ہوتا تو یقیناً اُن میں ایک ایسی انفرادیت پیدا ہو جاتی جو انسان کو سماج سے متنفر بنا دیتی ہے۔ لیکن باقر مہدی نے چراغ کے جل بجھنے کا غم کئے بغیر اُس روشنی کو دیکھا جو چراغ کا حاصل کہی جا سکتی ہے۔ اس نے انھیں خود پرستی اور خودشکنی دونوں سے بچایا۔ ماحول نے انھیں ایک ایسا احساسِ الم دیا، جس کی شدت زمانے نے کبھی کم نہیں ہونے دی۔ لیکن اس احساسِ الم سے انھوں نے فرار اور شکست خوردگی کے بجائے عزم اور اُمید کے جوہر نکالے۔ اس طرح وہ ذہنی حیثیت سے ایک تباہ کن رومانی انفرادیت کے غار کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود ہمیشہ اس میں گرنے سے بچتے رہے۔

یہ باقر مہدی پر موقوف نہیں ہے، اس عہد کے تقاضے ہر حساس انسان کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی طرف بھی دیکھتا رہے، اور سماج کی جانب بھی۔ نفسیات اور سماجیات کے بعض علماء نے ایک پر زور دیا ہے، بعض نے دوسرے پر۔ لیکن اکثر نے دونوں کے درمیان ایک قسم کے توازن کی جستجو کی ہے۔ کچھ لوگ اس موضوع کو شاعری کی بحث سے خارج قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ شاعری اعصاب کی زبان اور شخصیت کا اظہار ہے (ایلیٹ کے نزدیک اس کے برعکس ہے)،

سماج سے اس کا کیا واسطہ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اندرونی اور داخلی کش مکش جو تخلیقی شاعرانہ پیکر اختیار کرتی ہے، توازن کی اسی جستجو سے پیدا ہوتی ہے جو انسان اپنے باطنی اور بیرونی عناصر کے درمیان قائم کرنا چاہتا ہے۔ اِس میں اس کا ماحول، عقائد، فلسفۂ حیات اور نظریۂ فن تمام چیزیں کیمیاوی انداز میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اور چاہے وہ دل کے زخمی اور دماغ کے مجروح ہونے کا ذکر کرے یا محبت میں امید و بیم اور زندگی میں نشاط و الم کا، چاہے شکستِ آرزو اور تلخیٔ حیات کی بات کرے یا عزم بغاوت اور جہادِ زندگانی کی، وہ ہمیشہ اپنی شخصیت کے اس مرکز سے قریب رہتا ہے جس سے ہم اس کو، اس کی شاعری اور اس کی آواز کو پہچانتے ہیں۔ زندگی کی ہزارہا راہوں میں سے کسی راہ کے انتخاب اور انتخاب کے کرب کا معاملہ ہے جو پیچیدگی پیدا کرتا ہے، بہت سے ایسے مقامات سے گذرنا پڑتا ہے جہاں اپنے اجنبی ہونے کا احساس ہوتا ہے اور احساس کی صداقت چاہتی ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ تاکہ وجود کی پہنائیوں میں سفر کرنے والے اپنے ایک ہم جنس کے ذہنی اور جذباتی سفر کی منزلیں دیکھ لیں اور اپنے سفر پر رواں ہوں۔ باقر مہدی کی نظمیں اور غزلیں پڑھ کر مجھے ان تمام باتوں کا خیال آتا ہے کیونکہ اُن کے سفر میں یہ منزلیں آتی رہی ہیں جن سے وہ کبھی بآسانی اور کبھی دشواری کے ساتھ گذرے ہیں۔

اپنے ذہنی، جسمانی اور جذباتی تجربوں کی روشنی میں ہر شخص ایک چھوٹی سی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ باقر مہدی کی اس دنیا کا نام "شہر آرزو" ہے، اُن کے تخیل میں یہ شہر اجڑتا بستا رہتا ہے، اس کے نقشے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تمناؤں کی وسعت کبھی اِسے پھیلا کر ایک بڑی دنیا میں تبدیل کر دیتی ہے، کبھی خوابوں کی شکست سے دوچار ہو کر یہ ایک کھنڈر رہ جاتا ہے جس سے اس کے مکین کے سوا اور کسی کو دلچسپی نہیں ہو سکتی، انھوں

نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام کا نام "شہرِ آرزو" رکھا ہے جو اُن کی فکر اور فن کے بہت سے پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی نہیں، اس سے اُن کے بہت سے جذباتی اور ذہنی میلانات اور تجربات کا سراغ بھی ملتا ہے۔

باقر مہدی کی شاعری کی عمر ابھی بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس مجموعہ میں گذشتہ دس سال کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس میں کچھ رباعیاں ہیں، کچھ غزلیں، اور کچھ نظمیں۔ ان سب میں شاعر کے انفرادی اندازِ نظر کی جھلک موجود ہے۔ ایک تخلیقی فن کار اور خاص کر شاعر کے لئے فنّی نقطۂ نظر سے یہ بڑا مشکل سوال ہوتا ہے کہ وہ اپنی آواز میں اُن سماجی عناصر کی آواز کس طرح سموئے جن کی نمائندگی اس کے خیالات سے ہوتی ہے۔ اسی کوشش میں اُسے استعارات اور تشبیہات، رموز اور علامات سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنے احساسات اور تصورات کو ایمائی بنا کر وسعت دے سکے۔ اس کا یہ ادّعا تو یہ معنی ہوگا کہ اس کے اندر آفاق گم ہے یا وہ میں کہہ کر ساری کائنات مراد لیتا ہے۔ لیکن شاید یہ احساس بے جا نہ ہوگا کہ جب وہ زخم، مفلسی، بھوک، امیدوں کے خواب، ناآسودگی کے کرب اور مایوسی کے اندھیرے کا ذکر اپنے اشعار میں کرتا ہے تو اس کی آواز میں ان تمام لوگوں کی آواز شامل ہوتی ہے جو ان علامتوں کو اپنی ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ باقر مہدی کی غزلیں اور نظمیں پڑھنے والے کو یہی احساس ہوگا کہ اگرچہ ان میں شاعر کی شخصیت اور اس کے تجربوں کی جذباتی فضا ہر قدم پر موجود ہے۔ لیکن اس کا دائرہ وسیع ہو کر دوسروں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ گویا جہاں تک شمع کے جلنے کا تعلق ہے وہ تنہا جل رہی ہے لیکن اس کی روشنی اوروں کے لئے بھی ہے۔

ہر شاعر کی بعض نظمیں، اور کبھی کبھی تو بعض اشعار، مصرعے یا الفاظ اُس کے متعلق بہت کچھ کہہ جاتے ہیں کیونکہ اس کی ساری قوتِ اظہار سمٹ کر انھیں میں

مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور گویا ذرا سے اشارے میں وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔
باقر مہدی کی ابتدائی نظموں میں پہلی موت ایک ایسی ہی نظم ہے جس کا تجزیہ کیا جائے تو اُن کے ماضی، حال اور مستقبل سب کے دھندلے نقوش روشن ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اس میں اُس ماضی کا ذکر بھی ہے جس میں "شمعیں ہر ہر قدم پہ جلتی تھیں"۔ اس حال کا بیان بھی ہے جس میں "سازِ الفت کے تار ٹوٹ چکے"۔ اور اس مستقبل کی تاریکی بھی جس کا سراغ خود شاعر کو نہیں ملا تھا ماضی سے حال میں پہونچنا اپنے بہت سے جذباتی اور ذہنی رشتوں کی وجہ سے اُس کی پہلی جذباتی موت تھی، جس کے بعد بھی اُسے جینا تھا۔
باقر مہدی کے یہاں احساسِ غم کی شدت اور فراوانی کبھی کبھی یہ گمان پیدا کرنے لگتی ہے کہ زندگی ایک بوجھ ہے جسے انسان ایک لاش کی طرح اٹھائے ہوئے پھر رہا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جو یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جینا ایک مجبوری ہے اور انسان کو زندہ رہنے کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن یہاں بھی باقر مہدی نے اپنے عزائم اور جد و جہد سے اس تصوّر کو یاس پرستی کے بجائے اُمید اور یقین کے پھولوں سے سجا دیا ہے۔ اگر مستقبل پر یہ یقین نہ ہوتا تو وہ بہتر زندگی کی جد و جہد میں مسلسل منہمک نہ رہتے۔ ان کی ایک دلچسپ نظم جینا ہو گا اس حقیقت کی غماز ہے، اس کا پہلا ہی بند ہے

دل دھڑکتا ہے کبھی درد بھی بڑھ جاتا ہے
زخم ایسا ہے کہ بسمل نہیں ہونے پاتے
اشک پلکوں پہ محبت کی قسم کھاتے ہیں
آہیں سینے میں تری یاد کا دم بھرتی ہیں
نظریں تھک جاتی ہیں مایوسِ تمنا ہو کر
دل ناشاد بہل جاتا ہے ہنگاموں سے

ایک "مایوس تمنا" سے متعارف کرتا ہے لیکن اس کے سینے میں کوئی چنگاری اب بھی روشن ہے، جو اس کی زندگی کی پیاس کو بھڑکاتی اور شہرِ آرزو کے بسانے کی تمنا کو مہمیز کرتی ہے۔

کل کی تاریخ محبت سے عبارت ہوگی
اسی امید کی خاطر نئی دنیا کے لئے
درد میں ڈوب کے مر کے بھی جینا ہوگا

یہ خیالات اُس شخص کے نہیں ہو سکتے جو جینے کو ایک مجبوری تصوّر کرتا ہے بلکہ اُس کے ہیں جو مستقبل سے مایوس نہیں۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ باقر مہدی کسی مخصوص بنے بنائے نظریۂ زندگی کے پیرو یا مبلّغ ہیں۔ کیونکہ اُن کے یہاں جہدِ مسلسل، مسافر، اجنبی اور تلاش کے جو استعارے ملتے ہیں وہ اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔ ہم لوگ جو ان کی آخری نظموں میں سے ہے ان کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی حیثیت اس اعتراف کی ہے جسے انسان بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے فلسفۂ خیال اور احساسِ فن کا اعلان نامہ بن جاتا ہے۔ یہاں شاعر فلسفی بھی ہے شاعر بھی، خیال پرست بھی ہے عمل پسند بھی، دکھی بھی ہے مسرور بھی۔ کیونکہ زندگی خطِ مستقیم نہیں ایک پیچیدہ رہ گذر ہے، ایک آئینہ خانہ ہے جو حیران بھی بناتا ہے اور جلوے بھی دکھاتا ہے، اس میں اندھیرا روشنی سے الجھتا رہتا ہے، اور نئے موڑ آواز دیا کرتے ہیں، متضاد کیفیات کی یہ ترجمانی متضاد بیانی نہیں ہے بلکہ جذبات کی اس کش مکش کی تصویر کشی ہے جس میں شاعر اپنا راستہ تلاش کر رہا ہے اس طرح وہ اپنے ذہنی سفر کی ان مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے، جہاں اس کا کاروانِ خیال ٹھہرا تھا۔

ہمارے ملک میں ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی پریشاں حالی

مفلسی اور بے روزگاری کا معاملہ اتنا عام اور واضح ہے کہ اس کا ذکر بھی بے معنی اور تحصیل حاصل ہے۔ مفلسی تخیل کی باڑھ کند کرتی ہے، جذبات کو غلط سانچوں میں ڈھالتی ہے، خودداری اور بلند نگاہی کا خون کرتی ہے، محبت میں ناکام اور کاروبارِ حیات میں زخم خوردہ بناتی ہے۔ باقر مہدی نے جرم خودداری اور بغاوت پسندی میں بھوک کی سزا بھی جھیلی ہے اور ان کیفیات کی باز آفرینی اپنی نظموں میں کی ہے، اس لئے نہیں کہ ان نظموں کا پڑھنے والا اُن پر رحم کھائے بلکہ اس لئے کہ ان میں جن تاثرات کا بیان ہے اُن کی روشنی میں شاعر کے حوصلے، عزم بغاوت اور ذوقِ حیات کا مطالعہ کیا جائے، ایسی نظموں میں سماجی ناانصافیوں اور بے عنوانیوں کا ذکر کھل کر نہیں کیا گیا ہے، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، ہر ذہین پڑھنے والا ان کیفیات کو محسوس کرے گا جن کا جذباتی بیان ان نظموں میں ملتا ہے۔ ایسی نظموں میں بھوک ایک کامیاب نظم ہے جو آپ بیتی بھی ہے اور سماج پر طنز بھی۔

باقر مہدی کو فن کار، شاعر اور باغی کے منصب کا شدید احساس ہے، اُن کے لئے یہ اپنی دُھن میں کھوئے رومانی وجود نہیں ہیں بلکہ دنیا کے بدلنے والے، آزاد خیال، باہمت، خوددار اور جسور لوگ ہیں۔ سماج جن کی عزت کرنے پر مجبور رہوگا۔ یہ خیال بکھرے بکھرے مختلف نظموں اور غزلوں میں نظر آتے ہیں لیکن ایسے خلوص اور جوش سے آتے ہیں کہ انھیں شاعر کے عقائد کا جز تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک شاعر کو اپنے اس سماجی منصب کا احساس نہ ہو، اُسے ذمّہ داری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا، باقر مہدی اس احساس کو عزیز رکھتے ہیں۔

اس مختصر سے پیش لفظ میں صرف چند نظموں کا ذکر کیا جا سکا ہے اور وہ بھی محض اُن حقائق اور مسائل کی جانب اشارا کرنے کے لئے جن سے "شہر آرزو" کا پڑھنے والا دوچار ہوگا اور اگر وہ باقر مہدی کو سمجھ لے گا تو اُسے ان

نظموں کے سمجھنے میں کسی قدر آسانی ہوگی بعض دوسری نظمیں جو فنی حیثیت سے بھی دلکش ہیں اور شاعر کے ذہن تک بھی پہنچاتی ہیں ان عنوانات کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں، یہ سفر، شعور، شہرِ آرزو، نیئے انداز کا غم، نیئے سوال اور غم کدے میں اجنبی ان نظموں میں دورِ حاضر کے حساس اور تفکر پسند ذہن کی الجھنیں اور خواب ہائے پریشاں اس احساس کے ساتھ ملتے ہیں کہ آج نہیں تو کل ان کا حل ضرور نکلے گا۔

میں باقر مہدی کی غزلوں کا ذکر تفصیل سے نہیں کروں گا صرف اِدھر اُدھر سے چند اشعار پیش کروں گا جن میں مجھے صرف بھرپور تغزل ہی نہیں تصورات کا وہی پرتو ملتا ہے جو ان کی نظموں پر عکس افگن ہے۔

گذر رہا ہوں غموں کے نیئے مراحل سے
دردِ دل آج بھی ہے جوشِ وفا آج بھی ہے
عقل کی شمع نیئے عشق کی مشعل ہے مگر
بے خودی وجہِ سکونِ دلِ ناداں نہ ہوئی
غمِ جہاں سے الگ دردِ عشق رہ نہ سکا
ہزار راہ میں دشوار منزلیں آئیں
اس طرح کچھ بدل گئی ہے زمیں
ایسی بے گانگی نہیں دیکھی
ہر جگہ بجلیوں کی یورش ہے
قافلے خود سنبھل سنبھل کے بڑھے
کبھی تو بھول گئے پی کے نام تک ان کا
سنایا کرتے تھے دل کو حکایتِ دوراں
اے جنوں کون سی یہ منزل ہے

یہ وہ سفر ہے جہاں کوئی رہگذار نہیں
زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے
وحشتِ دل سے میں انکار کروں یا نہ کروں
خود کو رسوا سرِ بازار کروں یا نہ کروں
تمہیں بھی ساتھ لیئے اپنی کائنات چلی
قدم قدم پہ سنبھلتی ہوئی حیات چلی
ہم کو اب خوفِ آسماں نہ رہا
اب کسی کا کوئی یہاں نہ رہا
کیا کہیں اپنا آشیاں نہ رہا
جب کوئی میر کارواں نہ رہا
کبھی وہ یاد جو آئے تو پھر بھیا نہ گیا
مگر جو دل نے کہا ہم سے وہ سنا نہ گیا
کیا کریں کچھ ہمیں پتا ہی نہیں

بہار آئے گی لیکن ہماری دنیا میں
خزاں بدوش ابھی لالہ زار ہیں کتنے

یہ عشق حدِ غم سے گذر کر بھی راز ہے
اس کشمکش میں ہم سا کوئی مبتلا نہ ہو

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں کتنے ساتھی چھوٹ چکے ہیں
جانے کیوں دل اب تک تم کو اپنا سہارا جانے ہے

ان اشعار میں ایک حساس، پرسوز اور دردمند دل کی کہانی پوشیدہ ہے اور غزل کے سارے کیف کے ساتھ اشاروں میں بیان ہوئی ہے۔

گذشتہ دس سال میں باقر مہدی کی شاعری فکروفن میں ترقی کی جن راہوں سے گذری ہے انھیں پیشِ نظر رکھ کر یہ کہنا دشوار نہیں کہ مستقبل انھیں بلند تر مقام عطا کرے گا

سید احتشام حسین

بارود خانہ لکھنؤ
۲۸ جون ۱۹۵۸ء

اشعار میں ڈھلتا ہے مرا سوزِ دروں
افکار میں ملتا ہے حقیقت کا فسوں
زخموں کی نمائش نہیں منظور مجھے
حالات سے لڑتا ہے ابھی میرا جنوں

بیداری کا اِک دَور نیا آتا ہے
وحشت کا بھی انداز بدل جاتا ہے
اب اہلِ خرد خوش ہیں کہ دیوانہ بھی
محفل میں نئی شمع جلا جاتا ہے

اک خواب کی تعبیر حقیقت ہی نہ ہو
اندازِ تغافل میں محبّت ہی نہ ہو
خوابوں سے حقیقت کو سمجھنے والو
ممکن ہے تخیّل میں صداقت ہی نہ ہو

جذبہ ہر اک انداز میں ڈھل سکتا ہے
یہ سوزِ تمنّا سے بھی جل سکتا ہے
تاریک سہی راہِ محبت لیکن
چاہے اگر انساں تو سنبھل سکتا ہے

میخانے میں جانے کا یہ ہنگام نہیں
ہنگامہ اُٹھانے کا یہ ہنگام نہیں
ہاں غم کو اُمیدوں کا جنازہ نہ کہو
اس غم کو مٹانے کا یہ ہنگام نہیں

کہتے ہیں بصد ناز مرا نام نہ لو
کیسے ہیں یہ انداز مرا نام نہ لو
رسوائی سے ڈرتی ہے محبت ابتک
کھل جائیں گے سب راز مرا نام نہ لو

خوں ہو کے ٹپکتی ہے تمنّا دیکھو
آشفتگیٔ دل کا تماشا دیکھو
ہاں صبر کے دامن کا سہارا نہ ملا
بیتابی میں ہوتے ہوئے رسوا دیکھو

اب جذبۂ وحشت کی قسم مت کھاؤ
رہ رہ کے محبّت کی قسم مت کھاؤ
آنکھوں کی چمک کھول نہ دے سارا بھرم
خود اپنی صداقت کی قسم مت کھاؤ

ہر ایک حقیقت کا فسانہ ہوگا
اپنا بھی کبھی ایسا زمانہ ہوگا
خود اُن کی نظر ہوگی محبّت کی اسیر
دل اُن کا ہمارا بھی نشانہ ہوگا

خاموشی پہ الزام لگایا نہ کرو
بے وجہ محبّت بھی جتایا نہ کرو
ہم تم سے خفا ہو کے کہاں جائیں گے
تم ہم کو کسی طرح منایا نہ کرو

سمجھا ہوا جب کوئی اشارا نہ ملے
الفاظ کو معنی کا سہارا نہ ملے
وہ ہم سے جُدا ہو کے یہی کہتے ہیں
طوفان کو اب کوئی کنارا نہ ملے

ہر بات یہاں راز بنی جاتی ہے
مجبوری بھی دمساز بنی جاتی ہے
اب میری محبّت کی یہ منزل آئی
رُسوائی بھی ہمراز بنی جاتی ہے

بیتابی میں ہر طرح سے برباد رہا
دل اپنا غمِ دہر سے آباد رہا
پھرتا رہا ہر شہر میں مارا مارا
اے لکھنؤ تو مجھ کو مگر یاد رہا

سڑکوں پہ تری پھرتا تھا مارا مارا
دل غم سے ہوا جاتا تھا پارا پارا
مانا کہ محبّت کو ترستا ہی رہا
لیکن نہ مصائب سے کبھی میں ہارا

اے رُوحِ اودھ تیری محبّت کے نثار
میں اور مرا فن تیری عظمت کے نثار
ہاں تجھ سے بچھڑ کر نہ ملا چین مجھے
ہیں خواب مرے تیری حقیقت کے نثار

آلام و مصائب میں گرفتار سہی
اِک جہدِ مسلسل کا سزاوار سہی
کیا سمجھیں گے اَحباب تباہی میری
میں لاکھ بغاوت کا گنہ گار سہی

ہر لحظہ دھڑکتا ہے دلِ خانہ خراب
ہر لمحہ بجاتا ہے بغاوت کا رباب
جینے کی مری عمر ہے جینے دو مجھے
اس درد میں جینا بھی تو ہے کارِ ثواب

ہر رنگ میں اُمید کا تارا چمکا
سیلاب کے آتے ہی کنارا چمکا
تاریک سہی رات مگر دیکھو تو
وہ دُور بغاوت کا شرارا چمکا

یہ رات جدائی کی بہت روشن ہے
پھیلا ہوا یادوں کا ابھی دامن ہے
اس رات بھی اشکوں کے دیئے جلتے ہیں
شاید مرے خوابوں کا یہیں مدفن ہے

مرحوم تمنّاؤں کو کیا یاد کریں
کس کس سے کہیں، کیسے یہ فریاد کریں
خود ہم نے تباہی کی قسم کھائی تھی
کس طرح سے پھر شکوۂ بیداد کریں

کیوں انجمنِ غیر میں فریاد کریں
پھر خود کو نئی طرح سے آزاد کریں
لو ٹھوکریں کھانے کا بلاوا آیا
اب چل کے نئے شہر کو آباد کریں

کہنے کو بہت اہلِ قلم آئے ہیں
ہم سے مگر اس شہر میں کم آئے ہیں
کیا بات ہے جچتی نہیں کوئی شے بھی
کیا جانئے کیا سوچ کے ہم آئے ہیں

آئینۂ مہتاب لئے آئے ہیں
شعروں میں مئے ناب لئے آئے ہیں
اس دورِ حقیقت میں بھی اے فن کارو!
ہم کتنے حسیں خواب لئے آئے ہیں

سرمائے کی عظمت کا نشاں دیکھ لیا
دیکھا نہ کبھی تھا وہ سماں دیکھ لیا
آنکھوں میں چمکتی ہوئی جنّت دیکھی
سینے میں جہنّم ہے نہاں دیکھ لیا

پھر اپنی تمناؤں کا دھاگا ٹوٹا
ہاتھوں سے محبت کا وہ دامن چھوٹا
پھر آگیا رسوائی کا موسم یارو!
دل آبلہ تھا ایک نظر سے پھوٹا

کیوں قہرِ خداوند مجازی سے ڈرو
آزاد رہو بندہ نوازی سے ڈرو
محمود کی الفت کا زمانہ یہ نہیں
ڈرنا ہے تو پھر رسمِ ایازی سے ڈرو

طوفان نئی طرح اٹھا دیکھیں تو
دیوار گری، شور ہوا دیکھیں تو
اک جست میں طے راہِ محبت ہوگی
روکے گا تمھیں کون ذرا دیکھیں تو

مانا کہ ہر اک طرح کے حائل غم ہیں
آجاؤ کہ پھر بزم میں تنہا ہم ہیں
ملتے ہیں کہاں ایسے محبّت والے
اس دور میں دیوانے بہت ہی کم ہیں

سو طرح کے صدموں سے گذرنا کیسا
جینا ہے تو گھٹ گھٹ کے یہ مرنا کیسا
یہ لوگ کبھی ہم کو نہ جینے دیں گے
لڑنا ہے زمانے سے تو ڈرنا کیسا

کہتے رہیں یہ لوگ کہ اچھّا نہ ہوا
وہ کون سا عاشق ہے کہ رسوا نہ ہوا
آزاد رہو اپنی محبّت کے لئے
یہ کیا ہے کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا

آخری رات غزل کوئی سُناتے جاؤ
شمع اِک اور اُمیدوں کی جلاتے جاؤ

لرز لرز کے نہ ٹوٹیں تو وہ ستارے کیا

جنھیں نہ ہوش ہو غم کا وہ غم کے مارے کیا

مہکتے خون سے صحرا، جلے ہوئے گلشن

نظر فریب ہیں دنیا کے یہ نظارے کیا

اُمید و بیم کی یہ کشمکش ہے رازِ حیات

سکوں نواز! ہیں اس کے سوا سہارے کیا؟

کوئی ہزار مٹائے اُبھرتے آئے ہیں

ہم اہلِ درد جنونِ جفا سے ہارے کیا

(ردولی ۴۸ء)

دلوں کے درد کی سوزِ نہاں کی آزمائش ہے
جہانِ نو میں عزمِ کامراں کی آزمائش ہے

ابھی طوفانِ ظلم و جور کی آمد ہی آمد ہے
خلوصِ عشق کی، شوقِ جواں کی آزمائش ہے

کئی خوابیدہ نغمے سازِ دل سے پھر الجھ بیٹھے
جنوں میں ضبطِ غم، آہ و فغاں کی آزمائش ہے

ہم اہلِ درد گھبراتے نہیں دار و سلاسل سے
ابھی تو مہرباں، نامہرباں کی آزمائش ہے

کہاں فصلِ بہاراں اور چمن آرائیاں کیسی
حقیقت میں فریبِ باغباں کی آزمائش ہے

طلسمِ رہبری ٹوٹے ہوئے مدت ہوئی لیکن
نئی راہوں پہ اہلِ کارواں کی آزمائش ہے

محفلوں میں جا کے گھبرایا کئے

دل کو اپنے لاکھ سمجھایا کئے

یاس کی گہرائیوں میں ڈوب کر

زخمِ دل سے خود کو بہلایا کئے

تشنگی میں یاس و حسرت کے چراغ

غم کدے میں اپنے جلوایا کئے

خود فریبی کا یہ عالم تھا کہ ہم

آئینہ دنیا کو دکھلایا کئے

خونِ دل عنوانِ ہستی بن گیا

ہم تو اپنے ساز پر گایا کئے

لکھنؤ ۱۹۵۰ء

کیوں آرزو ہو موت کی جو چارہ گر ملے
لیکن ہمیں تو آج تلک نوحہ گر ملے

نشتر زنی کا آج بھی دستورِ عام ہے
ہم کو تو ہر زمانے میں بیداد گر ملے

ہم رہروانِ عشق بھی منزل پہ دم نہ لیں
جوشِ جنوں کے ساتھ جو ذوقِ سفر ملے

تاریکیوں کو اپنے جِلو میں لئے ہوئے
ایسے بھی اس زمانے میں شمس و قمر ملے

اب "خضر" سے بزرگ بھی رہزن کے ساتھ ہیں
اس جنگِ زرگری میں کسے راہبر ملے

اس دَور میں بھی نغمہ سرائی گناہ ہے
غالب سے یہ کہیں جو وہ "آشفتہ سر" ملے

کبھی کبھی دلِ ناداں کو یاد آتی ہیں
وہ آرزوئیں کہ جن کا کوئی مزار نہیں

فریب خوردہ ہیں یہ آئینے محبّت کے
نیازِ حُسن کی کوئی بھی یادگار نہیں

بھُلا چکا ہوں تجھے آج کیوں یہ عالم ہے
کہ سوچتا ہوں مجھے تیرا انتظار نہیں

سکوں کا راز تخیّل کی زندگانی ہے
غمِ حیات کی منزل پہ بھی قرار نہیں

گذر رہا ہوں غموں کے نئے مراحل سے
یہ وہ سفر ہے جہاں کوئی رہگذار نہیں

دردِ دل آج بھی ہے جوشِ وفا آج بھی ہے
زخم کھانے کا محبّت میں مزا آج بھی ہے

گرمیٔ عشق نگاہوں میں نہیں ہے نہ سہی
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں حیا آج بھی ہے

حُسن پابندِ قفس، عشق اسیرِ آلام
زندگی جُرمِ محبت کی سزا آج بھی ہے

حسرتیں زیست کا سرمایہ بنی جاتی ہیں
سینۂ عشق پہ وہ مشقِ جفا آج بھی ہے

دامنِ صبر کے ہر تار سے اٹھتا ہے دھواں
اور ہر زخم پہ ہنگامہ اٹھا آج بھی ہے

اپنے آلام و مصائب کا وہی درماں ہے

"درد کا حد سے گذرنا" ہی دوا آج بھی ہے

میر و غالب کے زمانے سے نئے دور تلک

شاعرِ ہند گرفتارِ بلا آج بھی ہے

ردولی سنہ ۵۱ء

نگاہیں چشمِ حوادث سے لڑتی جاتی ہیں

کوئی حیات کو رنگین خواب کیا جانے

ہجومِ یاس میں بھی خواہشِ اجل نہ ہوئی

فریبِ زیست کوئی کامیاب کیا جانے

ہے مری رسمِ وفا پاسِ محبّت کے لئے
بے قراری کا میں اظہار کروں یا نہ کروں

عقل کی شمع نئے عشق کی مشعل ہے مگر
وحشتِ دل سے میں انکار کروں یا نہ کروں

جانے نغموں میں محبّت کا اثر ہو کہ نہ ہو
تیز تر گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

بے خودی وجہ سکونِ دلِ ناداں نہ ہوئی
خود کو رسوا سرِ بازار کروں یا نہ کروں

خونِ دل اپنا ابھی نذرِ جہاں ہوتا ہے
سوچتا ہوں تجھے غمخوار کروں یا نہ کروں

اب خانماں خراب کی منزل یہاں نہیں
کہنے کو آشیاں ہے مگر آشیاں نہیں
"عشقِ ستم نواز" کی دنیا بدل گئی
"حُسن وفا شناس" بھی کچھ بدگماں نہیں
میرے صنم کدے میں کئی اور بت بھی ہیں
اِک میری زندگی کے تمہیں رازداں نہیں
تم سے بچھڑ کے مجھ کو سہارا تو مل گیا
یہ اور بات ہے کہ میں کچھ شادماں نہیں
اپنے حسین خواب کی تعبیر خود کرے
اتنا تو معتبر یہ دلِ ناتواں نہیں

زلفِ دراز قصۂ غم میں اُلجھ نہ جائے

اندیشہ ہائے عشق کہاں ہیں کہاں نہیں

ہر ہر قدم پہ کتنے ستارے بکھر گئے

لیکن رہِ حیات ابھی کہکشاں نہیں

سیلابِ زندگی کے سہارے بڑھے چلو

ساحل پہ رہنے والوں کا نام و نشاں نہیں

لکھنؤ ۵۳ء

ہر طرف رقص کناں، نغمہ فشاں ہوگی حیات
جام چھلکاتی ہوئی آئے گی اپنی برسات

غم کو منزل جو سمجھتے ہیں یہ اُن سے کہہ دو
ختم ہوگا نہ کبھی سلسلۂ راہِ حیات

ہر طرف شور ہے افسردہ دلی ختم ہوئی
وادئ غم سے گذرتی ہے اُمیدوں کی برات

گردشِ چرخِ کہن ختم ہوئے دیر ہوئی
مہر و مہ لے کے اُٹھے ہاتھ میں لاکھوں ذرّات

علی گڈھ ۵۳ء

تمہاری زلف نے قصّے کہے اسیری کے
تمہارے ذکر سے دار و رسن کی بات چلی

ستارے ٹوٹ کے کہتے ہیں اشکِ پنہاں ہے
سنبھال دردِ محبت کو اب تو رات چلی

غمِ جہاں سے الگ دردِ عشق رہ نہ سکا
تمہیں بھی ساتھ لئے اپنی کائنات چلی

نفس نفس سے بدلتی رہی فضائے جہاں
نظر نظر سے سنورتی ہوئی حیات چلی

سجائی جاتی ہے مشرق میں زندگی کی دلہن
اٹھو اٹھو کہ نئے دَور کی بَرات چلی

ہزار راہ میں دشوار منزلیں آئیں
قدم قدم پہ سنبھلتی ہوئی حیات چلی

علی گڑھ ۵۳ء

جو زمانے کا ہم زباں نہ رہا
وہ کہیں بھی تو کامراں نہ رہا

اس طرح کچھ بدل گئی ہے زمیں
ہم کو اب خوفِ آسماں نہ رہا

جانے کن مشکلوں سے جیتے ہیں
کیا کریں کوئی مہرباں نہ رہا

ایسی بیگانگی نہیں دیکھی
اب کسی کا کوئی یہاں نہ رہا

ہر جگہ بجلیوں کی یورش ہے
کیا کہیں اپنا آشیاں نہ رہا

مفلسی کیا گلہ کریں تجھ سے
ساتھ تیرا کہاں کہاں نہ رہا

حسرتیں بڑھ کے چومتی ہیں قدم
منزلوں کا کوئی نشاں نہ رہا

خونِ دل اپنا جل رہا ہے مگر
شمع کے سر پہ وہ دھواں نہ رہا

غم تمہیں ہم تباہ ہو کے رہے
حادثہ بھی تو ناگہاں نہ رہا

قافلے خود سنبھل سنبھل کے بڑھے
جب کوئی میرِ کارواں نہ رہا

کیا خبر تھی کہ کبھی بے سر و ساماں ہوں گے
فصلِ گل آتے ہی اس طرح سے ویراں ہوں گے

در بدر پھرتے رہے خاک اڑاتے گذری
وحشتِ دل ترے کیا اور بھی احساں ہوں گے

راکھ ہونے لگیں جل جل کے تمنائیں مگر
حسرتیں کہتی ہیں کچھ اور بھی ارماں ہوں گے

یہ تو آغازِ مصائب ہے نہ گھبرا اے دل
ہم ابھی اور ابھی اور پریشاں ہوں گے

ق

میری دنیا میں ترے حسن کی رعنائی ہے
تیرے سینے میں مرے عشق کے طوفاں ہوں گے

کافریِ عشق کا شیوہ ہے مگر تیرے لئے

اس نئے دَور میں ہم پھر سے مسلماں ہوں گے

لاکھ دشوار ہو ملنا مگر اے جانِ جہاں

تجھ سے ملنے کے اسی دَور میں امکاں ہوں گے

تو انہی شعروں پہ جھُومے گی بہ اندازِ دگر

ہم تری بزم میں اک روز غزلخواں ہوں گے

علی گڑھ ۵۴ء

جام چھلکائیں گے گائیں گے تری یاد میں ہم
غم و آلام اٹھائیں گے تری یاد میں ہم

خون ہوتا ہے تمنّاؤں کا اس دنیا میں
نئی دنیا ئیں بسائیں گے تری یاد میں ہم

تجھ سے ملنے کی نکالیں گے نئی راہ کوئی
جذبۂ شوق بڑھائیں گے تری یاد میں ہم

چاندنی رات میں لکھیں گے غزل تیرے لئے
جشنِ مہتاب منائیں گے تری یاد میں ہم

اجنبی شہر میں پوچھے گا بھلا کون ہمیں
دربدر ٹھوکریں کھائیں گے تری یاد میں ہم

علی گڑھ ۵۴ء

مٹ مٹ کے چمکتا ہے محبّت کا نشاں اور
رُک رُک کے اٹھا کرتا ہے سینے سے دھواں اور

پلکوں پہ چمکتے ہوئے اشکوں پہ نہ جاؤ
سینے میں غمِ دل کے خزانے ہیں نہاں اور

شعروں میں ترا حُسن ہے تصویر نہیں ہے
شاعر کی زباں اور مصوّر کی زباں اور

طوفانوں میں گھر اپنا بناتی ہے جوانی
بڑھتی ہے بغاوت سے مری فکرِ جواں اور

سر دے کے نئی صبح کی تعظیم کریں گے
جی بھر کے لٹائیں گے متاعِ دل و جاں اور

بمبئی ۵۵ء

ہزار چاہا لگائیں کسی سے دل لیکن
بچھڑ کے تجھ سے ترے شہر میں رہا نہ گیا

کبھی یہ سوچ کے روئے کہ مل سکے تسکیں
مگر جو رونے پہ آئے تو پھر ہنسا نہ گیا

کبھی تو بھول گئے پی کے نام تک اُن کا
کبھی وہ یاد جو آئے تو پھر پیا نہ گیا

سنایا کرتے تھے دل کو حکایتِ دوراں
مگر جو دل نے کہا ہم سے وہ سُنا نہ گیا

سمجھ میں آنے لگا جب فسانۂ ہستی
کسی سے حالِ دلِ زار پھر کہا نہ گیا

بمبئی ۱۹۵۵ء

چراغِ حسرت وارماں بجھا کے بیٹھے ہیں
ہر ایک طرح سے خود کو جلا کے بیٹھے ہیں

نہ کوئی راہگذر ہے نہ کوئی ویرانہ
غمِ حیات میں سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں

جنوں کی حد ہے کہ ہوش و خرد کی منزل ہے
خبر نہیں ہے کہاں آج آ کے بیٹھے ہیں

کبھی جو دل نے کہا اب چلو یہاں سے چلیں
تو اٹھ کے عالم وحشت میں جا کے بیٹھے ہیں

یہ کس جگہ یہ قدم رک گئے ہیں کیا کہیئے
کہ منزلوں کے نشاں تک مٹا کے بیٹھے ہیں

بمبئی ۱۹۵۵ء

دیکھئے ہم سے نہ رہیئے گا خفا آج کے دن
گونجتی ہے یہی رہ رہ کے صدا آج کے دن

بخش دیجیے دلِ گستاخ کی ساری باتیں
کوئی دیوانے کو دیتا ہے سزا آج کے دن

میکدہ اپنا نہیں ہے نہ سہی جام تو ہے
خونِ دل بھر کے پیئیں گے بخدا آج کے دن

آپ کے دل پہ یہ نغمات اثر کر کے رہیں
ہم تو کرتے ہیں یہی ایک دعا آج کے دن

کل یہ باتیں نئے افسانے بنائیں گی مگر
اک حقیقت ہے محبت کی نوا آج کے دن

بمبئی ۵۵ء

یہ شورشیں ہیں جہدِ مسلسل کی برکتیں
یہ رونقِ جہاں بھی محبت کے غم سے ہے

اِک جنبشِ نگاہ نے آوارہ کر دیا
شوقِ فزوں بھی آپ کی چشمِ کرم سے ہے

کہنے کو حُسن کی ہیں جنوں خیزیاں مگر
دیوانگی کا نام ہمارے ہی دَم سے ہے

غم میں خوشی کے راز نہاں ہیں ابھی تلک
صُبحِ وطن کی فکر بھی شامِ الم سے ہے

بمبئی ۱۹۵۵ء

طوفانوں سے ٹکر لی تھی یہ تو کنارا جانے ہے

ساحل پر ہم ڈوب رہے ہیں کیا یہ دھارا جانے ہے

نام ہمارا جب آتا ہے تم چپ رہ کر خوش ہوتے ہو

کہنے کو یہ راز ہے لیکن عالم سارا جانے ہے

یہ دنیا ہے دیوانوں سے بزم سجی ہے پروانوں سے

شمع ہو تم یہ بات نہ مانو دل تو تمہارا جانے ہے

شہروں شہروں ملکوں ملکوں آوارہ ہم پھرتے ہیں

راہِ وفا کا ذرّہ ذرّہ نام ہمارا جانے ہے

دل کی جیتیں، دل کی ماتیں جادوگر کی ساری باتیں

شام کا تارا جانے نہ جانے صبح کا تارا جانے ہے

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں کتنے ساتھی چھوٹ چکے ہیں
جانے کیوں دل اب تک تم کو اپنا سہارا جانے ہے

میرؔ ہوئے تھے کل دیوانے آج ہوئے ہیں ہم دیوانے
فرزانوں کی یہ دنیا انجام ہمارا جانے ہے

بمبئی ۱۹۵۵ء

عام پھر گمرہی کرے کوئی
یوں مری رہبری کرے کوئی

تلخئ مے ہے تیری باتوں میں
کیوں نہ پھر دوستی کرے کوئی

پھر نہ بن جاؤں ایک دیوانہ
درد میں کچھ کمی کرے کوئی

عشق کی ساری باتیں اے دل پاگل پن کی باتیں ہیں
زلفِ سیہ کے سائے میں بھی دار و رسن کی باتیں ہیں

ویرانوں میں جا کے دیکھو کیسے پھول کھلے ہیں
دیوانوں کے ہونٹوں پر اب سرو سمن کی باتیں ہیں

کل تک اپنے خون کے آنسو مٹی میں مل جاتے تھے
آج اسی مٹی سے پیدا نظمِ چمن کی باتیں ہیں

ٹھوکر کھاتے پھرتے ہیں اک صبح یہاں اک شام وہاں
آوارہ کی ساری باتیں کوہ و دمن کی باتیں ہیں

دیکھیں کب کرنیں ابھریں گی دیکھیں کب تارے ڈوبیں گے
ہجر کی شب میں اب تک یارو صبحِ وطن کی باتیں ہیں

اورنگ آباد ۱۹۵۵ء

فریب کھا کے بھی شرمندۂ سکوں نہ ہوئے

نہ کم ہوا کسی منزل پہ ولولہ دل کا

یہ سوچ کر تری محفل سے ہم چلے آئے

کہ ایک بار تو بڑھ جائے حوصلہ دل کا

پلٹ کے اب نہ کبھی لکھنؤ سے گذریگا

نکل گیا ہے بہت دور قافلہ دل کا

حریفِ عشق کوئی ہو حریفِ غم تو نہیں

کسی سے ہو نہ سکے گا مقابلہ دل کا

کوئی کسی کا نہیں ہم زباں زمانے میں

کریں تو کس سے کریں جا کے اب گلہ دل کا

شکست کھانے کا یارا نہیں یہ کیا کیجے
اِک اجنبی سے پڑا ہے مقابلہ دل کا
تمھاری نذر بھی لائے جو ہم تو کیا لائے
ذرا سنبھال کے رکھنا یہ آبلہ دل کا

بمبئی ۵۶ء

ترا پیغام کیا اب یاد تک تیری نہیں آتی
مگر بے نام سی دل میں خلش محسوس ہوتی ہے

کون بھلا یہ کہتا ہے خود آ کے ہم کو منائیں آپ
ٹوٹا دل اب کیسے جڑے گا سچی قسمیں نہ کھائیں آپ

پتھر سینے پر رکھ لیں گے جیتے جی مر جائیں گے
آپ کو قاتل کون کہے گا کیوں ناحق گھبرائیں آپ

راہِ وفا پہ چلتے چلتے اپنی عظمت بھول گئے تھے
چھوڑی ہم نے رسم پرستش اب کرم فرمائیں آپ

دُور سے بیٹھے بیٹھے ہم تو شمع کو تکتے رہتے ہیں
پروانوں کی خاک اُڑا کر محفل پہ چھا جائیں آپ

سحر کیا، اعجاز کیا ہے درد کا شعلہ برف بنا ہے
ترکِ محبّت ہم کو مبارک کیوں ناحق پچھتائیں آپ

تشنہ لبی کچھ اور بڑھی ہے مے خواری کی دھوم مچی ہے

آخر ہم سے رندِ بلاکش کیسے پیاس بجھائیں آپ

جوشِ جنوں کا دَور نہیں ہے دل کے سکوں کا دَور نہیں ہے،

غم ہے نیا، کیسے کم ہوگا آئیں آپ نہ آئیں آپ

بمبئی ۵۶ء

رسوا ہو کر راہِ وفا میں کتنے ہمت ہار گئے

میں نے رسوائی کے ہاتھوں جینے کا سامان کیا

کڑوی کڑوی تیری باتیں، غیر ضروری میری باتیں

ان دونوں کے اک سنگم کا خوابوں میں ارمان کیا

جب سے اِک اجنبی کی نظر دل کو چھو گئی
وحشت بڑھی، قرار گیا، جستجو گئی

سوچا تھا اس تعلقِ خاطر کے باوجود
تجھ سے کہیں گے دل سے تری آرزو گئی

دیوانگی پہ ہم کو بڑا ناز تھا مگر
اِک چپ سی لگ گئی جو ترے رُوبرو گئی

تیرے سوا ہر اک نے سنی اور رو پڑا
جیسے شکستِ دل کی صدا کو بکو گئی

کوئی نہ غم گسار ملا بمبئی میں بھی
بربادِ زندگی کی خبر چار سو گئی

باقرؔ تمہاری موت کا پیغام لے چلی
بادِ صبا یہ کہتی ہوئی لکھنؤ گئی

۵۶ء

دشمنِ جاں کوئی بنا ہی نہیں
اتنے ہم لائق جفا ہی نہیں

آزما لو کہ دل کو چین آئے
یہ نہ کہنا کہیں وفا ہی نہیں

ہم پشیماں ہیں وہ بھی حیراں ہیں
ایسا طوفاں کبھی اُٹھا ہی نہیں

جانے کیوں ان سے ملتے رہتے ہیں
خوش وہ کیا ہوں گے جب خفا ہی نہیں

تم نے اِک داستاں بنا ڈالی
ہم نے تو رازِ غم کہا ہی نہیں

غم گُسار اس طرح سے ملتے ہیں
جیسے دنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں

اے جنوں کون سی یہ منزل ہے
کیا کریں کچھ ہمیں پتا ہی نہیں

موت کے دن قریب آ پہنچے
ہائے ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں

کیا کیا نہیں کیا مگر ان پر اثر نہیں
شاید کہ اپنی سعیِ جنوں کارگر نہیں

گھبرا کے چاہتے ہیں کہ گردش میں ہم رہیں
منزل کہیں نہ ہو کوئی ایسا سفر نہیں

مل جائے ایک رات محبت کی زندگی
پھر خواہشِ حیات ہمیں عمر بھر نہیں

آوارگی میں لطف و اذیت کے باوجود
ایسا نہیں ہوا ہے کہ فکرِ سحر نہیں

۵۶ء

یہ پھول ہیں تو مگر داغدار ہیں کتنے؟
امانتِ غمِ فصلِ بہار ہیں کتنے؟
ہماری آنکھوں میں رقصاں ہے حسرتوں کی چمک
ہمارے پہلو میں پیوست خار ہیں کتنے؟
ہمارے چہرے ہیں آئینے بیکسی کے مگر
ہمارے سینے میں غم کے مزار ہیں کتنے؟
چمکتے رہتے ہیں یوں تو ہزار ہا انجم
مگر ان اشکوں سے وہ تابدار ہیں کتنے؟
سمجھنے والے نیا غم سمجھ نہیں سکتے
ہمارے ایسے یہاں رازدار ہیں کتنے؟
ملے گی ہم کو بھی منزل مگر خبر ہے کسے
کہ راہِ عشق میں حائل غبار ہیں کتنے؟

بہار آئے گی لیکن ہماری دنیا میں
خزاں بدوش ابھی لالہ زار ہیں کتنے ؟

بلا سے جہد مسلسل میں زندگی گذرے
کہ حادثات کے امیدوار ہیں کتنے ؟

نشاطِ غم سے معطر دماغ کر جائے
صبا سے کہہ دو کہ ہم سوگوار ہیں کتنے ؟

۱۹۵۷ء

شبِ سیاہ میں اہلِ وفا نے رہ رہ کر
چراغِ دردِ محبّت جلائے ہیں کیا کیا
کہیں مسافرِ الفت کو منزلیں نہ ملیں
سنبھل سنبھل کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

ہر ایک لمحہ ٹھہر کر یہ ہم سے کہتا ہے
کسی کی یاد میں اس درجہ بے قرار نہ ہو

ٹھہر بھی جاؤ ملاؤ نہ خاک میں آنسو
کہیں تبسّم پنہاں کی یادگار نہ ہو

جنوں شباب پہ ہے کیا ڈریں زمانے سے
نہیں ہے اپنا اگر کوئی رازدار نہ ہو

نہیں ہے تم کو محبت یونہی سہی لیکن
یہ بات کیا ہے کہ کوئی وفا شعار نہ ہو

جلاؤ پھر سے چراغِ وفا سرِ منزل
کہیں قریب ہی دیکھو کوئی مزار نہ ہو

تمہارے درد کو باقرؔ وہ کیا سمجھ سکتے
غزل سنا کے انھیں آج سوگوار نہ ہو

سنہ ۶۵۷

وہ رند کیا کہ جو پیتے ہیں بیخودی کے لئے
سرور چاہیئے وہ بھی کبھی کبھی کے لئے

یہ کیا کہ بزم میں شمعیں جلا کے بیٹھے ہو
کبھی ملو تو سرِ راہ دشمنی کے لئے

ق

اودھ کی شام، رفیقوں کو، مہ جبینوں کو
ہر اک کو چھوڑ کے آئے تھے بمبئی کے لئے

مگر یہ کیا کہ بجز درد کچھ ہمیں نہ ملا
عجیب شہر ہے یہ ایک اجنبی کے لئے

ہزار چاہیں نہ چھوٹے گی ہم سے یہ دنیا
یہیں رہیں گے محبت کی بیکسی کے لئے

کوئی پناہ نہیں کوئی جائے امن نہیں
حیات جہد مسلسل ہے آدمی کے لئے
یہ کہہ رہا ہے کوئی اپنے جاں نثاروں سے
کچھ اور چاہئے اب رسمِ عاشقی کے لئے
کہاں کہاں نہ پکارا، کہاں کہاں نہ گئے
بس اک تبسمِ پنہاں کی روشنی کے لئے
سنہ ۵۷ء

عشق کی پلکوں پہ خون دل لرزتا ہے ابھی
ٹوٹنے والے ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا

چاہا بہت کہ عشق کی پھر ابتدا نہ ہو
رسوائیوں کی اپنی کہیں انتہا نہ ہو

جوشِ وفا کا نام جنوں رکھ دیا گیا
اے دردِ آج ضبطِ فغاں سے سوا نہ ہو

یہ غم نہیں کہ تیرا کرم ہم پہ کیوں نہیں
یہ تو ستم ہے تیرا کہیں سامنا نہ ہو

کہتے ہیں ایک شخص کی خاطر جیئے تو کیا
اچھا یونہی سہی تو کوئی آسرا نہ ہو

یہ عشق حدِ غم سے گذر کر بھی راز ہے
اس کشمکش میں ہم سا کوئی مبتلا نہ ہو

اس شہر میں ہے کون ہمارا ترے سوا
یہ کیا کہ تو بھی اپنا کبھی ہمنوا نہ ہو

۵۷ء

شمع آنچل سے بجھاتا ہے کوئی دیکھو تو!
غم کدہ چھوڑ کے جاتا ہے کوئی دیکھو تو!

دل دھڑکتا ہے کہ آہٹ سی یونہی ملتی ہے
پاس آ کے بلاتا ہے کوئی دیکھو تو!

کیسا جذبہ ہے بڑھا جاتا ہے لمحہ لمحہ
مات ہر گام پہ کھاتا ہے کوئی دیکھو تو!

اب جو ہنستے ہیں تو اشکوں کی قسم کھاتے ہیں
حوصلہ غم کا بڑھاتا ہے کوئی دیکھو تو!

سامنا بھی نہ رہے اور نظر بھی آئیں
خواب اک ایسا دکھاتا ہے کوئی دیکھو تو!

ایک حیرت ہے گماں اور یقیں ختم ہوئے
رازِ دل آج سناتا ہے کوئی دیکھو تو!

تاکہ پھر کوئی کبھی راہِ وفا پر نہ چلے
نقشِ پا اپنے مٹاتا ہے کوئی دیکھو تو!

اب نہ ملنے کی قسم کھاکے سناتے ہیں غزل
بے کسی اپنی بڑھاتا ہے کوئی دیکھو تو!

۱۹۵۷ء

ہزار ماہ و نجوم چمکے، حسین صبحیں بھی آئیں لیکن
غمِ محبت کو جو مٹا دے کہیں وہ شام و سحر نہیں ہے

تو پریشاں ہے محبّت کے تعلق سے مگر
ہم تو ناز‌اں ہیں کہ تجھ سا ہمیں دلدار ملا

زندگانی کو نئی طرح سمجھنا ہے تو سن!
تجھ کو اِک جہدِ مسلسل کا سزا وار ملا

نام ہے جس کا عبادت یہ محبت وہ ہے
کیوں پشیماں ہے کہ اک ہم سا گنہ گار ملا

کوئی ملتا نہ تو اتنی نہ شکایت ہوتی
ہم تو سمجھے تھے کہ آخر کوئی غم خوار ملا

موت کے بعد ہماری تجھے یاد آئے گا
ہائے وہ شخص جو تنہا سرِ بازار ملا

سنہ ۵۷ء

کسی پہ کوئی بھروسہ کرے تو کیسے کرے
کہ آنسوؤں کے سوا اور کوئی کیا دے گا

بہت ہوا تو تبسّم کے چند پھولوں کو
نگاہِ شوخ کے ہاتھوں سے بیوفا دے گا

چلے تو جاتے ہو روٹھے ہوئے مگر سن لو!
ہر ایک موڑ پہ کوئی تمھیں صدا دے گا

عجیب منزلِ حیرت میں ہے جہانِ خراب
کہ جیسے ہم سے دوانوں کو بھی سزا دے گا

ہمارے شعر میں پنہاں ہے روشنی غم کی
ذرا سنو تو سرِ شام یہ ضیا دے گا

سنہ ۵۷ء

بے نام اشارے پہ جئیں گے کب تک
یونہی سے سہارے پہ جئیں گے کب تک
سنتے ہیں کہ روشن تھی کبھی یہ دنیا
بے نور ستارے پہ جئیں گے کب تک
ہے آخری بازی یہ محبّت کی مگر
مانا کہ نہ ہارے پہ جئیں گے کب تک
اب آؤ جدا ہو کے چلیں طوفاں میں
غم خوار! کنارے پہ جئیں گے کب تک

کبھی تمھیں جو محبّت کا حادثہ ہو جائے
تو ایک بار ہمیں دل میں یاد کر لینا

۱۹۵۷ء

وہ کون سا ستم ہے اٹھایا نہیں ہنوز
یہ اور بات ہے کہ بتایا نہیں ہنوز

گو دوستی نہیں یہ چلن تو وہی رہا
دشمن کسی کو اپنا بنایا نہیں ہنوز

دنیا عجیب ہے مجھے پاگل کہا کرے
لیکن کسی کو میں نے ستایا نہیں ہنوز

پھرتا ہوں روز و شب انھیں راہوں پہ دیکھ لے
آوارگی کا شوق بڑھایا نہیں ہنوز

کس طرح تو حیات کے معنی سمجھ گیا
میں زندگی کی راہ پر آیا نہیں ہنوز

کتنوں کا ساتھ چھوٹ گیا، کچھ خبر نہیں
کیا بات ہے کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز
کیوں بے وفا سمجھ کے مگر چاہتا رہا
یہ راز میں نے تجھ سے بتایا نہیں ہنوز
باقرؔ تباہیوں کی بھی منزل گذر گئی
یہ کیا ہوا کہ ہوش میں آیا نہیں ہنوز
۵۷ء

جب تک کہ دوستی کا تعلق نہ ہو کہیں
یادوں کے پھول کھل نہ سکیں گے بہاریں
ہے نام بے بسی کا، کوئی راز ہے ضرور
کیوں آپ ہم سے مل نہ سکیں گے بہاریں

شہرہ بہت ہے اب تو سیاست کا ان دنوں
افسانہ بن گیا ہے صداقت کا ان دنوں

سنتا ہے کون اپنے جنوں کی حکایتیں
سودا ہوا ہے سب کو حقیقت کا ان دنوں

کیا خواب انقلاب کا دیکھے کوئی بھلا
ہے سرنگوں علم بھی بغاوت کا ان دنوں

تسکینِ دل ملے تو ستاروں سے کیا ملے
گہنا گیا ہے چاند محبت کا ان دنوں

اب غیر ہم سے آ کے یہ کہتے ہیں بزم میں
ہوتا ہے ذکر آپ کی جرأت کا ان دنوں

پچھلا سا وہ خلوص کہاں، رسم و راہ ہے
کچھ اور ہی چلن ہے شرافت کا' ان دنوں
باقرؔ وہ بت بھی توڑ دیا ہائے کیا کیا
چرچا بہت ہے آپ کی وحشت کا ان دنوں

۱۹۵۷ء

وہ جا چکے ملیں گے نہ اب عمر بھر تجھے
اے دل اب ان کو پھر سے مناتے کے دن گئے
راس آ گئی ہے ہم کو محبت کی بیکسی
پیہم وہ حادثات اٹھانے کے دن گئے

خبر سنے گا مری موت کی تو خوش ہو گا

کہ اب تو جا کے دوانے کو چین آئے گا

ملیں گے مجھ سے کہیں اچھے جاں نثار تجھے

مگر کبھی تو مرا ذکر آ ہی جائے گا

نہ ایسا ہو مگر ایسا ہوا تو کیا ہو گا

سکوں تلاش کرے گا کہیں نہ پائے گا

عجیب دور ہے کچھ بھی یہاں یہ ممکن ہے

جو یاد رکھنا بھی چاہا تو بھول جائے گا

زمانہ گذرے گا ٹوٹیں گے سیکڑوں رشتے

پھر ایک شخص فسانہ مرا سنائے گا

کوئی ہنسے گا دوانے کی زندگی پہ مگر
کسی کی آنکھ میں اک اشک آ ہی جائے گا
نہ دوستوں کی شکایت نہ دشمنوں کا گلہ
یہ سوچتا ہوں کسے کون اب منائے گا

۵۷ء

اپنے دامن پہ ذرا دیر تو رو لینے دے
داغِ محرومی اسی طرح سے دھو لینے دے
نیند آئی نہیں کب سے یہ ہیں یاد نہیں
حسرتوں ہی کی گھنی چھاؤں میں سو لینے دے

اور کوئی جو شنے خون کے آنسو روئے
اچھی لگتی ہیں مگر ہم کو تمہاری باتیں

ہم ملیں یا نہ ملیں پھر بھی کبھی خوابوں میں
مسکراتی ہوئی آئیں گی ہماری باتیں

ہائے اب جن پہ مسرت کا گماں ہوتا ہے
اشک بن جائیں گی اک روز یہ پیاری باتیں

یاد جب کوئی دلائے گا سرِ شام تمہیں
جگمگا اٹھیں گی تاروں میں ہماری باتیں

اُن کو مغرور بنایا ہے بڑی مشکل سے
آئینہ بن کے رہیں کاش ہماری باتیں

ملتے ملتے یونہی بیگانے سے ہو جائیں گے
دیکھتے دیکھتے کھو جائیں گی ساری باتیں

وہ بہت سوچیں تڑپ اٹھیں مگر اے باقرؔ
یاد آئیں تو نہ آئیں یہ تمہاری باتیں

۱۹۵۸ء

جی بہت ہے ابھی جی بھر کے تڑپ لینے دو
خود بہل جائے گا اک دن دلِ ناداں اپنا

اس درجہ ہوا خوش کہ ڈرا دل سے بہت میں
خود توڑ دیا بڑھ کے تمنّاؤں کا دھاگا

تا کہ نہ بنوں پھر کہیں اک بندۂ مجبور
ہاں قیدِ محبّت سے یہی سوچ کے بھاگا

ٹھوکر جو لگی اپنے عزائم نے سنبھالا
میں نے تو کبھی کوئی سہارا نہیں مانگا

جلتا رہا میں ریت پہ پیاسا تن تنہا
بہتی رہی کچھ دُور پہ اک پیار کی گنگا

میں تجھ کو مگر جان گیا شمعِ تمنّا!
سمجھی تھی کہ جل جائے گا شاعر ہے پتنگا

آنکھوں میں ابھی تک ہے خمارِ غمِ جاناں
جیسے کہ کوئی خوابِ محبت سے ہے جاگا
جو خود کو بدل دیتے ہیں اِس دور میں باقرؔ
کرتے ہیں حقیقت میں وہ سونے پہ سہاگا

۱۹۵۸ء

حُسن کی باتیں یاد رہیں
عشق کا عالم بھول گئے
آنسو میں اک دنیا دیکھی
ہم جامِ جم بھول گئے
وہ ہم کو پہچان نہ پائے
ہم ان کا غم بھول گئے

بدل کے رکھ دیں گے یہ تصوّر کہ آدمی کا وقار کیا ہے؟
خلا میں وہ چاند ناچتا ہے، زماں مکاں کا حصار کیا ہے!

بہک گئے تھے سنبھل گئے ہیں ستم کی حد سے نکل گئے ہیں
ہم اہلِ دل یہ سمجھ گئے ہیں کشاکشِ روزگار کیا ہے!

ابھی نہ پوچھو کہ لالہ زاروں سے اُٹھ رہا ہے دھواں وہ کیسا
مگر یہ دیکھو کہ پھول بننے کا آرزومند خار کیا ہے؟

وہی بنے دشمنِ تمنّا، جنھیں سکھایا تھا ہم نے جینا
اگر یہ پوچھیں تو کس سے پوچھیں کہ دوستی کا شعار کیا ہے؟

کبھی ہے شبنم، کبھی شرارا، فلک سے ٹوٹا تو ایک تارا
غمِ محبت کے راز دارو! یہ گوہرِ آبدار کیا ہے؟

بہار کی تم نئی کلی ہو، ابھی ابھی جھوم کر کھلی ہو
مگر کبھی ہم سے یونہی پوچھو کہ حسرتوں کا مزار کیا ہے؟
بہ ایں تباہی دکھائے ہم نے وہ معجزے عاشقی کے تم کو
بہ ایں عداوت کبھی نہ کہنا کہ آپ سا خاکسار کیا ہے؟
بنے کوئی علم و فن کا مالک کہ ہیں ہوں راہِ وفا کا سالک
نہیں ہے شہرت کی فکر باقرؔ غزل کا اک راز دار کیا ہے!

۱۹۵۸ء

برباد کر کے راہِ محبّت میں زندگی

آباد کر رہا ہوں نیا شہرِ آرزو

زخموں کے پھول کھل گئے یادوں کی شاخ پر

اِک گلستاں بنا ہے مرا شہرِ آرزو

کوئی افسانہ نہیں

آج گھبرا کے جنوں خیز نگاہوں سے نہ دیکھ
میں ترے عشق میں اتنا ابھی مجبور نہیں

ٹوٹتے جاتے ہیں رہ رہ کے ستارے لیکن
شب ہجراں میں یہ آہِ سحری کیا معنی؟
خود فریبی کے طلسمات کا افسوں کب تک
وحشتِ عشق کی یہ بے خبری کیا معنی؟
رنگ محلوں کا تصوّر تو نہیں حاصلِ غم
جاگتی آنکھوں کی یہ بے خبری کیا معنی؟
تو "محبت" کو جنوں ہنس کے کہا کرتی ہے
عقل کے دور میں آشفتہ سری کیا معنی؟

تیز دھاروں سے الگ رہنے کی کوشش کیسی
آرزوؤں کے لئے شیشہ گری کیا معنی ؟

میری پلکوں پہ لرزتے ہوئے اشکوں پہ نہ جا
جرأتِ عشق کا تیرے یہاں دستور نہیں
ایک شاعر ہوں، محبّت کا خریدار نہیں
تجھ کو دھوکے میں رکھوں یہ مجھے منظور نہیں

تو مرے درد کا درماں نہیں معلوم ہے یہ
میں ترے خواب کی تعبیر نہیں بن سکتا
تیرے گلشن میں بہاروں کے سوا کیا ہوگا
ایسے ماحول کی تصویر نہیں بن سکتا
تو یونہی سوچ کے غمگین رہا کرتی ہے
میں ترے "درد" کی تفسیر نہیں بن سکتا
تیرے معیارِ محبت کی حفاظت کے لئے
میں کوئی سونے کی شمشیر نہیں بن سکتا
تو مری زیست کی تقدیر نہیں بن سکتی
میں ترے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتا

یہ حقیقت ہے فسانہ نہیں اے جانِ سخن!
تیری دنیا میں اُجالا ہے مگر نُور نہیں
جگمگاتے ہوئے رنگین ستاروں کو نہ دیکھ
تیری دنیا مری دنیا سے بہت دُور نہیں

اک ذرا سوچ کہ ہر لمحہ بدلتا ہے جہاں
آج تک اپنی محبّت کی نہیں آئی سحر
نکہت و نور کے محلوں کی تمنّا کیسی
ہاں مگر بخش دے تو ایک محبت کی نظر
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں کی حسرت ہے مجھے
میری ویران سی دنیا میں کہاں لطفِ سفر
آسمانوں کی فضاؤں میں نہ پرواز کرو
کہکشاں اپنی محبّت کی نہیں راہ گذر
آج کے دَور میں الفت کے نئے عنواں ہیں
کوئی دیوانہ نہیں کوئی نہیں خاک بسر

تیرے ماحول سے نفرت بھی ہے بیزار بھی ہوں
جانے کیوں تیری محبّت کا طلبگار بھی ہوں

جینا ہوگا

دل دھڑکتا ہے کبھی درد بھی بڑھ جاتا ہے
زخم ایسا ہے کہ بسمل نہیں ہونے پاتے
اشک پلکوں پہ محبت کی قسم کھاتے ہیں
آہیں سینے میں تری یاد کا دم بھرتی ہیں
نظریں تھک جاتی ہیں مایوسِ تمنا ہو کر
دلِ ناشاد بہل جاتا ہے ہنگاموں سے

وہی موہوم تبسم وہی اندازِ ستم
مری آہوں مرے اشکوں کا صلہ یہ تو نہیں
میں بصد شوق تری بزم میں کیسے آؤں
یہ حسیں نظم تری نذر کروں یا نہ کروں
مفلسی راہ میں دامن سے لپٹ جاتی ہے
بیکسی چھپ کے کہیں دیر تلک روتی ہے

میں اُفق تا بہ اُفق دیکھ کے چپ رہتا ہوں
فکرِ نو گھرے خیالات میں کھو جاتی ہے

وادیٔ غم میں بڑے عزم سے رکھا تھا قدم
زخم پر زخم لگے گا مجھے معلوم نہ تھا

حسرتیں راکھ ہوئیں گل ہوئے اشکوں کے چراغ
اپنے سینے سے مگر اب بھی دھواں اٹھتا ہے

یہ شکایت نہیں کیوں تیرا سہارا نہ ملا
دلِ ناداں کو ابھی خود ہی سنبھلنا ہو گا

آج فنکار کو تم بزم میں رُسوا نہ کرو
کل اسی فن کی زمانے میں عبادت ہو گی

آج فنکار کی، الفت کی کوئی قدر نہیں
کل کی تاریخ محبت سے عبارت ہو گی

اِسی اُمید کی خاطر، نئی دنیا کے لئے
درد میں ڈوب کے مر مر کے بھی جینا ہو گا

لکھنؤ ۱۹۵۲ء

پہلی موت

شبِ مہتاب اور یہ سناٹا
وہ جنوں خیز چاندنی نہ رہی
سیمیں کرنوں کی آگ کیا ہوگی
شعلۂ دل کی روشنی نہ رہی

اب بہکتے نہیں قدم اپنے
وہ الم سوز بیخودی نہ رہی
منزلِ شوق کا خیال نہیں
جستجو کی وہ گمرہی نہ رہی

دھڑکنیں کوئی گیت گا نہ سکیں
دردِ دل کی وہ نغمگی نہ رہی
سازِ الفت کے تار ٹوٹ چکے
نغمہ سنج اپنی زندگی نہ رہی

میرے ماضی کی خوابگاہوں میں
شمعیں ہر ہر قدم پہ جلتی تھیں
ولولے چونک چونک اٹھتے تھے
حسرتیں خامشی سے پلتی تھیں
بُت شکن حوصلوں کی جنبش سے
وحشتیں دوش پر مچلتی تھیں
خود فریبی کے رنگ محلوں میں
حیرتیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں
زندگانی کی کاوشیں اکثر
لڑکھڑاتی ہوئی سنبھلتی تھیں
ہر طرف اک غبار چھایا تھا
راہیں ہر موڑ پر بدلتی تھیں

بے خطر خار زار راہوں پر
بڑھ رہے تھے قدم جمائے ہوئے

چڑھ گئے ہم کبھی چٹانوں پر
حوصلوں کے علم اٹھائے ہوئے
حسرتوں اور آرزؤں کے
راز سینے میں تھے چھپائے ہوئے
شعلے ہر ہر قدم لپکتے تھے
دامنِ شوق تھے بچائے ہوئے
تیز گامی پہ مسکراتے تھے
بے خیالی میں زخم کھائے ہوئے
جانے کس لمحے تم نظر آئے
آرزو کے کنول کھلائے ہوئے
اور اک لرزشِ تبسّم سے
آئینے دل کے جگمگائے ہوئے
ہر نفس خواب کے دریچے پر
ہر نظر داستاں سنائے ہوئے

دھریں چپکے چپکے گاتی تھیں
خلشِ دل مگر بڑھائے ہوئے
رُوحِ نغمہ تمھیں سمجھتے تھے
اپنا سازِ وفا جگائے ہوئے
اہلِ زر کا بھی کچھ خیال نہ تھا
"سازشِ غیر" تھے بھلائے ہوئے
ایسی "دیوانگی" کے عالم میں
اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے

وہ شب و روز کیا ہوئے اے دل
جب چراغاں تھا ماہ پاروں سے
پھول کھلتے تھے اپنی آنکھوں میں
گرمئ بزم تھی شراروں سے

داستانیں سنا سنا کے تمھیں
بات کہتے تھے ہم اشاروں سے

ظلمتِ شب میں روشنی کے لئے
اشک پلکوں پہ آئے تاروں سے

دلِ طوفاں شکن نہیں ہارا
لاکھ طوفاں اُٹھے کناروں سے

ہم خزاں میں تمہاری یاد لئے
جی رہے ہیں انھیں سہاروں سے

چاند تھرا کے دُور ڈوب گیا
اب تو خوابوں میں دلکشی نہ رہی

منزلِ شوق کا خیال آیا
بیخودی کی وہ گمرہی نہ رہی

فکر نے مشعلیں جلائی ہیں
کیا ہوا پچھلی چاندنی نہ رہی
تم سے چھٹ کر بھی اس زمانے میں
اپنی دنیا میں بیکسی نہ رہی
ہر قدم سوچ کے اٹھاتے ہیں
دل ناداں کی رہبری نہ رہی
یہ نیا دور ہے محبت کا
وہ سکوں بخش زندگی نہ رہی

لکھنؤ ۵۲ء

بہت ہے ایک نظر

قدم قدم پہ مجھے یہ خیال آتا ہے
تری نظر کا سہارا ملے تو کیا کم ہے!
خزاں میں رہ کے بہاروں کی آرزو نہ کروں
جو زخمِ دل بھی مہک کر کھلے تو کیا کم ہے!
ہزار چاک ہیں دامانِ زندگی کے مگر
جو ایک چاکِ گریباں سلے تو کیا کم ہے!

تمام تیرہ منازل سے میں گذر جاؤں
جو ایک شمعِ محبت جلے تو کیا کم ہے!
وہ گیت جو مرے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتا
وہ اشکِ غم کے سہارے ڈھلے تو کیا کم ہے!
رہِ حیات میں دیوانگی کی منزل پر
سنبھل سنبھل دلِ ناداں چلے تو کیا کم ہے!

یہ گومتی، یہ اودھ کی حسین رقّاصہ

میں سوچتا ہوں اِسے رازداں بنا ڈالو

فضا پہ سُرمئی آنچل اُڑھا کے دُور تلک

اسی زمیں پہ نیا آسماں بنا ڈالو

یہ میرے اشکِ محبّت کے پاسدار بھی ہیں

جو تو کہے تو نئی کہکشاں بنا ڈالو

بہت ہے ایک نظر بھی جو غم کی محرم ہو

میں اس نظر سے نیا آستاں بنا ڈالو

قدم قدم پہ مجھے یہ خیال آتا ہے

تری نظر کا سہارا ملے تو کیا کم ہے

لکھنؤ ۱۹۵۳

خیال آتا ہے

آج تنہائی میں رہ رہ کے خیال آتا ہے
ٹوٹ جائے نہ کہیں سلسلۂ خواب و خیال
میری خاموش محبّت کا یہ انجام نہ ہو
میں سرِ راہ سرِ بزم کہیں مل نہ سکوں
تجھ کو یہ خوف رہے تو کہیں بدنام نہ ہو
ہونٹ ترسیں، مری آنکھیں یونہی ویران رہیں
تیرے ہاتھوں میں مرے نام کا اک جام نہ ہو
حسرتیں تیرے لئے خون کے آنسو روئیں
اور سنّاٹا سا چھایا رہے کہرام نہ ہو

میں بصد عزم اٹھوں اور قدم بڑھ نہ سکیں
دل دھڑکتا رہے اور گردشِ ایّام نہ ہو
منزلِ عشق میں کھو جائے سفر ختم نہ ہو
اور ہر لمحہ یہی فکر کہیں شام نہ ہو
آج تنہائی میں رہ رہ کے خیال آتا

لکھنؤ ۵۳

بھُوک

میرے احساس کے شعلے بھی بجھے جاتے ہیں
میری تخئیل میں پرواز کی طاقت نہ رہی
دل کی دھڑکن میں وہ پہلی سی حرارت نہ رہی
میرے انفاس کی گرمی بھی مٹی جاتی ہے

بھوک کی آگ میں جلتی ہے مری فکر جواں
رُوح بیدار ہے اب تک ہے وہی سوزِ تپاں
آج افکار کے پھولوں کو بھی جلنا ہوگا
ہے یہ وہ آگ کہ رگ رگ کو پگھلنا ہوگا

مدّتیں گذریں کہاں خواب، کہاں تعبیریں
اپنے ہاتھوں میں ابھی تک ہیں وہی زنجیریں
نغمے خاموش ہیں ہونٹوں پہ کہ ہمّت نہ رہی
وحشتیں سر بہ گریباں ہیں کہ جرأت نہ رہی
دلِ ناداں تری باتوں میں حلاوت نہ رہی
ہے یہ وہ غم کہ محبّت کی حکایت نہ رہی

بھوک کی آگ میں جذبات نہ مرجائیں ک
میرے اشعارِ تخیّل میں نہ جل جائیں ک

مرے احباب مرے غم کو سمجھنے والو!
راز کی بات کہاں اپنی سحر تک نہ ہوئی
کیا کہو گے کہ تمھیں میری خبر تک نہ ہوئی؟

۲

شہر یہ اپنی تمناؤں کا مرکز تھا کبھی
آج سڑکوں پہ لرزتے ہوئے اُٹھتے ہیں قدم

بھوک سے بڑھ کے زمانے میں نہیں کوئی ستم

بھوک، افلاس کی نعمت ہے محبّت کی سزا

شعر و نغمات کی دنیا میں ہے سیلابِ بلا

اب یہ سیلاب مری روح سے ٹکراتا ہے
جانے کس طرح کی رونے کی صدا آتی ہے
موت کی وادئ ظلمت سے ہوا آتی ہے
دل دھڑکتا ہے تو جینے کی ندا آتی ہے

مرے نغمات، مری فکر جواں کیا ہو گی!
کون سنتا ہے بھلا میری فغاں کیا ہو گی!
لاکھ چاہوں یہ مری سوختہ جاں کیا ہو گی!!!

۳

شہر اک خوابِ شکستہ کی طرح ویراں ہے
حسرتیں پھر بھی محبت کا سبق دیتی ہیں

شاہراہوں پہ تڑپتے ہیں مرے خواب مگر
دھڑکنیں مجھ کو بغاوت کا سبق دیتی ہیں

آج جینے کی قسم کھا کے سنبھلنا ہو گا
بھوک کی آگ میں سو طرح سے جلنا ہو گا

لکھنؤ ۵۳ء

شعور

رموزِ دہر کو اہلِ نظر سمجھتے ہیں
دماغ و دل ابھی برق و شرر سے بنتے ہیں
حسین دنیا کے خاکے ہمارے ذہن میں ہیں
نئے زمانے تو فکرِ سحر سے بنتے ہیں

حیات فکر و نظر سے حیات بنتی ہے
کہ تیرگی میں اسی طرح نور ملتا ہے
شراب، وحشتِ دل کی دوا بھی لیکن
خمار اترنے پہ اکثر سرور ملتا ہے

دماغِ عشق کو سمجھا کے آرزوئے نیاز
غرورِ حسن کو بخشا ادا و ناز کا فن
شعور دیتا ہے خود آگہی کے آئینے
کہ جس میں چمکے محبت کے ساتھ اس کا چلن

پیام ہے یہ نئی زندگی کی راہوں کو
قدم قدم پہ نئے باب وا کئے جائیں
سنبھل سنبھل کے بڑھے کاروانِ اہلِ نظر
کہ ذہن و دل کے سہارے نہ چھوٹنے پائیں

طلسمِ بے خبری کا فریب ختم ہوا
کہ نورِ علم سے روشن ہے یہ جہانِ خراب
مزاجِ دیدہ و دل اب بدلتے جاتے ہیں
کہ اب عروج پہ آیا ہے جراتوں کا شباب

حیات آج عبارت ہے ہوشمندی سے
جنوں کے دور میں فکر و نظر کی بات نہ کر
ہزار ظلمتیں وحشت بدوش ہوں لیکن
سمجھ کے جمالِ سحر کی بات نہ کر

لکھنؤ ۵۳ء

یہ سفر

راہیں کھو جاتی ہیں بڑھتے بڑھتے
پاؤں تھک جاتے ہیں چلتے چلتے
یہ سفر ختم نہ ہوگا اے دل
شمع بجھ جائے گی جلتے جلتے

کتنے ارمانوں کا دامن چھوٹا
زخم سینے میں فروزاں کیوں ہیں؟
اجنبی راہوں سے کوئی پوچھے
وحشتیں سر بہ گریباں کیوں ہیں؟

میری نظمیں ہیں محبت کا صلہ
آج فنکار کا انعام کہاں!
درِ میخانہ کھُلے یا نہ کھُلے
اپنے ہونٹوں کے لئے جام کہاں!

چاند غم خوار نہیں بن سکتا
کہکشاں ساتھ مرا چھوڑ چلی
اشک جگنو بھی نہیں بن سکتے
مفلسی رشتۂ غم توڑ چلی

آج تنہائی ہے سنّاٹا ہے
دھڑکنیں کس کو صدا دیتی ہیں
کون آئے گا دلاسا دینے
حسرتیں کس کو ندا دیتی ہیں؟

جستجو کی کوئی حد بھی ہوگی
منزلِ شوق کسے ملتی ہے!
حسرتو! ساتھ نہ چھوڑو میرا
دل دھڑکتا ہے کلی کھلتی ہے

زندگی رات کے سنّاٹے میں
دعوتِ جہد دیئے جاتی ہے
کتنے طوفان ہوں، شمعِ اُمید
چاکِ دل پھر بھی سیئے جاتی ہے

راہیں کھو جاتی ہیں بڑھتے بڑھتے
پاؤں تھک جاتے ہیں چلتے چلتے
یہ سفر زیست کا سرمایہ ہے
شمع بجھ جانے دو جلتے جلتے

لکھنؤ ۵۳ء

نئے انداز کا غم!

(اپنی بہن کے نام)

ی ہمشیر، مرے غم کو سمجھنے والی!
سے وابستہ رہا ہے مرا عہدِ طفلی
خواب کی طرح سے اُس دور کی یاد آتی ہے
جب کہ کیا شے ہے حقیقت، مجھے معلوم نہ تھا
حیرتیں شمعِ ہدایت تھیں کھلونوں کی طرح
اور کیا چیز ہے جرأت مجھے معلوم نہ تھا
اپنے ماحول کی تلخی کا بھی احساس نہ تھا
اک جہنم ہے یہ جنت، مجھے معلوم نہ تھا
اپنے ماں باپ کی الفت بھی بدل سکتی ہے
رسمِ الفت ہی ہے نفرت، مجھے معلوم نہ تھا

بیکسی کیسے بغاوت کو جنم دیتی ہے
کیسے ہوتی ہے بغاوت، مجھے معلوم نہ تھا

روز و شب، شام و سحر یونہی گذر جاتے تھے
جانے وہ لمحے خفا ہو کے کدھر جاتے تھے

(۲)

اپنا گھر، اپنا وطن چھوڑ رہا تھا جس دم
ہر نفس جہدِ مسلسل کا خیال آتا تھا
تیرے آنسو مرے دامن سے لپٹ جاتے تھے
ہر قدم صبر کی منزل سے گذر جاتا تھا
میں تجھے اپنے عزائم کا سہارا دے کر
رازِ ہستی نئے انداز سے سمجھاتا تھا
کیا خبر تھی کہ ہیں یہ آخری باتیں اپنی
جانے کیا سوچ کے ملنے کی قسم کھاتا تھا
آج تک یاد ہے وہ آخری ساعت مجھ کو
جبکہ اشکوں میں تبسم کی چمک پاتا تھا

مجھ کو آئے ہوئے اس شہر میں مدت گذری
آج تک صبح پریشاں ہے تو افسردہ ہے شام
مفلسی، فاقہ کشی سخت مراحل ہیں مگر
حوصلے اپنے جواں ہیں نہیں خوفِ انجام
کشمکش آج بہت تیز ہوئی جاتی ہے
ہر قدم ایک نئے دور کا لاتا ہے پیام
ایک فنکار ہوں، باغی ہوں یہی کیا کم ہے
کل نہ تھی آج بھی مجھ کو نہیں فکرِ انعام
لاکھ زہراب کی بارش ہو مگر عزم جواں
فکرِ آزاد کو دیتا ہے مئے سرخ کے جام

...صائب کا زمانہ ابھی آغاز کا ہے
...ں نہ گھبرا کہ یہ غم تو نئے انداز کا ہے

لکھنؤ ۵۳ء

یہ رات

ستارے چپ ہیں کہ چلتی ہے تیز تیز ہوا
یہ رات اپنی محبت کی رات بھی تو نہیں
فضا میں یادوں کے جگنو چمک رہے ہیں ابھی
حسین یادوں کو لیکن ثبات بھی تو نہیں
غمِ حیات سے مانوس ہو چلا ہے دل
نئے نئے ہی سہی سانحات بھی تو نہیں
بدل کے رکھ دیں جو لیل و نہار دنیا کے
ابھی حیات کے وہ حادثات بھی تو نہیں
وہی ہے خونِ تمنّا ، وہی ہے حسرتِ غم
یہ موت بھی تو نہیں ہے حیات بھی تو نہیں

یہ رات، جہدِ مسلسل کی ایک رات سہی
تباہیوں کو لئے بار بار گذرے گی
کوئی بتائے کہاں تک کہ زندگی کی یہ رات
فسردہ گذری ہے اور سوگوار گذرے گی
ابھی تو روز یہی فکر ہے جئیں کیسے
ابھی تو رات یونہی بیقرار گذرے گی
سکونِ دل کے لئے آج بھی یقیں سا ہے
اسی چمن سے خزاں شرمسار گذرے گی
نئے چراغ جلائیں امیدِ فردا سے
کبھی تو وادئ غم سے بہار گذرے گی

یہ رات ایک نئی یادگار لائی ہے
سجا کے زخموں کے پھولوں کا ہار لائی ہے

علی گڈھ ۵۳ء

خَط

کس کا خط لے کے مسرت کا پیام آیا ہے
کس کی یادوں سے اُمیدوں نے سہارے پائے؟
کون تحریر میں چھپ کر مرے پاس آیا ہے
کس کی باتوں سے محبّت کے شرارے پائے؟
میری تاریک سی دنیا میں یہ چمکے کیسے
کس کے ہاتھوں سے سکوں بخش ستارے پائے؟
کون سمجھائے کہ ہر لفظ کے معنی ہیں نئے
کیسے جذبات کے طوفاں نے اشارے پائے؟

(۲)

ری تخیل نے خوابوں کی بنالی دنیا

عشق کے واسطے اتنا سا جنوں کیا کم ہے!

ری آنکھوں میں تبسم کی جگہ آنسو ہیں

مجھ کو ملتا ہے جو اتنا بھی سکوں کیا کم ہے!

اک دامن مرا اک روز رفو ہو کہ نہ ہو

غم کو میں بھول گیا ہوں یہ فسوں کیا کم ہے!

ل دھڑکتا ہے مسرّت کا عجب عالم ہے

دَرد خود بڑھ کے یہ کہتا ہے کہوں کیا کم ہے!

میری آہوں، مرے اشکوں کی بھی قیمت تو ملی

چند لمحوں کے لئے، مجھ کو مسرّت تو ملی

علی گڑھ ۶۵۴

ایک ملاقات

نہ جانے کیسے یہ لمحے ملے فراق کے بعد
کہ تجھ سے مل کے دلِ زار مسکرا نہ سکا
ہر اک نفس میں بڑا انتظار تھا لیکن
بہت قریب پہنچ کر تجھے بھی پا نہ سکا
بہت طویل نہ تھی داستانِ غم لیکن
ہجومِ شوق میں کچھ بھی تجھے سنا نہ سکا
ہزار طرح سے چاہا بیاں کروں لیکن
حیات بخش کوئی راز بھی بتا نہ سکا
خموش نظروں کی بیچارگی گواہ رہی
کہ اک چراغِ مسرت بھی میں جلا نہ سکا
یونہی اداس گذرتے رہے حسیں لمحے
اودھ کی شام، شبِ غم میں ڈھل گئی آخر

مجھے تو تیری ہی مجبوریوں کا پاس رہا
خود اپنی آس بھی رہ رہ کے جل گئی آخر

(۲)

طروں سے جی بھر کے پی شراب مگر
بچھڑ کے تجھ سے وہی تشنگی سی ملتی ہے

نبھل کے ملاہوں تجھے خبر بھی ہے
خرد کے پاس بھی آشفتگی سی ملتی ہے

ہ راتوں میں آتا ہے جب خیال ترا
قدم قدم پہ مجھے روشنی سی ملتی ہے

کے دور میں ملتے رہیں یہ کیا کم ہے
کہ تجھ سے مل کے نئی آگہی سی ملتی ہے

انِ محبت نئی نہیں لیکن
اسی کے غم میں مجھے اک خوشی سی ملتی ہے

(لکھنؤ ۵۴ء)

آج کے بعد

تیرے کوچے میں نہ رکھیں گے قدم، آج کے بعد
دیکھیں گذرے گی کہاں شامِ الم آج کے بعد
تجھ سے ملتے بھی رہیں تجھ سے محبت نہ کریں
کیسے سہہ پائیں گے اس طرح کا غم آج کے بعد
ہیں چمکتے ہوئے جگنو ہی شبِ غم کے رفیق
اب نہ روئیں گے تری یاد میں ہم آج کے بعد
ٹوٹ جانے کو ہے وہ رشتۂ پنہاں اے دل
کس کی کھائیں گے محبت میں قسم آج کے بعد
کون اشعار تری نذر لئے آئے گا
کس پہ اُٹھے گی تری چشمِ کرم آج کے بعد

(۲)

بھول جانا انھیں آسان نہیں ہے لیکن
درد اٹھا بھی تو تڑپیں گے نہ ہم آج کے بعد

یاد رکھیں گے نہ اب اپنی پرانی نظمیں
بھول جائیں گے ترا طرزِ ستم آج کے بعد

اجنبی بن کے ملیں گے کسی محفل میں اگر
حادثہ یہ بھی کریں گے نہ رقم آج کے بعد

مفلسی توڑے گی کتنوں سے پرانے رشتے
کیسے احباب کا رکھیں گے بھرم آج کے بعد

لکھنؤ! تجھ سے محبت ہے مگر کیا کیجے!
اب نہ آئیں گے کبھی لوٹ کے ہم آج کے بعد

(علی گڑھ ۵۴ء)

سزا

بھول جانا انھیں آسان نہیں ہے اے دل!
تونے پہلے بھی کئی بار قسم کھائی ہے —
درد جب حد سے بڑھا ضبط کا یارا نہ رہا
اُن کی ایک ایک ادا یاد مجھے آئی ہے —

وہ تبسم میں نہاں طنز کے میٹھے نشتر
وہ تکلم میں تغافل کو چھپانے کی ادا
رک کے ہر لمحہ نئی طرح سے آغازِ ستم
جیسے کچھ کھو کے کسی چیز کو پانے کی ادا
میری خاموشی پہ بیباک نگاہی ان کی
جذبۂ شوق کو کچھ اور بڑھانے کی ادا

وہ مسلسل مری باتوں پہ توجہ کی نظر
رُخ پہ پھیلی ہوئی زلفوں کو ہٹانے کی ادا
میرے اشعار کو سنتے ہی وہ آنکھوں میں غرور
مجھ کو ہر طرح سے دیوانہ بنانے کی ادا
بیخودی دیکھ کے میری وہی بیگانہ روی
پاس آ آ کے بہت دُور وہ جانے کی ادا
رُخصتی لمحوں میں ہونٹوں پہ دعاؤں کا گماں
در پہ رُک کر مری خاطر سے وہ جانے کی ادا

ہ رہ کے تڑپتا ہوں نئی بات ہے کیا
نے کیوں ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے
ستم لاکھ کریں اُن کا تو شیوا ہے یہی
ں کی ترکِ محبت میں بھی رسوائی ہے
تو جلتے ہوئے جلنا ہی پڑے گا اے دل
نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے"

(علی گڑھ ۵۴ء)

نئے سوال

بگولے اُٹھتے ہیں شعلوں کا رقص جاری ہے
شکست خوردہ ابھی سے مری جوانی ہے
مری حیات پہ افسردگی سی طاری ہے
ہر ایک لمحہ مصائب کی اک کہانی ہے

وہ تیز دھوپ ہے سایہ نظر نہیں آتا
چمک چمک کے بڑھی جارہی ہے پیاس مری
کہوں یہ کیسے کہ اب تو چلا نہیں جاتا
قدم قدم پہ اکھڑنے لگی ہے سانس مری

وطن بھی چھوٹ گیا، لکھنؤ بھی چھوٹ گیا
ہر ایک شہر میں پھرتا ہوں دربدر مارا

بہت غرور تھا جس پر وہ خواب ٹوٹ گیا
مگر یہ عزم کہ سب کچھ ابھی نہیں ہارا

گلہ نہیں کہ وطن مجھ کو راس آ نہ سکا
وہ اپنا گھر جہاں سیکھا سبق بغاوت کا
وہاں کا طرزِ کہن مجھ کو راس آ نہ سکا
خود اپنے ہاتھوں سے توڑا صنم عقیدت کا

مجھے وطن کے در و بام سے محبّت تھی
یہ وہ زمانہ تھا جب زندگی مسرّت تھی
شریر صبح، حسین شام سے محبّت تھی
خیال و خواب کی دنیا ہی اک حقیقت تھی

گذر گیا یونہی بچپن، مجھے خبر نہ ہوئی
نظر اٹھائی تو خوابوں کی زندگی نہ رہی

وہ رات آئی کہ پھر آج تک سحر نہ ہوئی
مہ و نجوم میں پچھلی سی روشنی نہ رہی

کبھی جو رویا تو دامن کا آسرا نہ ملا
ہزار صبر کیا دل فریب کھا نہ سکا
کسی نے بات نہ کی کوئی ہمنوا نہ ملا
خموش رہ کے اداسی کا راز پا نہ سکا

شعور آیا تو لایا خیالِ اہلِ ستم
مری حیات نے مجھ سے نئے سوال کئے؟
غلام کون ہے ٹوٹا ہے کس پہ کوہِ الم؟
ہر ایک سمت اندھیرا ہے کیوں بجھے ہیں دیئے؟

یہ شورِ دیر و حرم کیا ہے زندگی کیا ہے؟
خدا کہاں ہے خدائی کا مدعا کیا ہے؟

یہ جام کیسے کھنکتے ہیں تشنگی کیا ہے؟
غریبِ شہر کے جینے کا آسرا کیا ہے؟

(۲)

یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کی خاطر
جلائی فکر نے مشعل، اُٹھے عمل کے قدم
کسی نے دل میں کہا "مرحبا بڑھے جاؤ
اٹھائے دوش پہ اپنے بغاوتوں کا عَلَم"

یہ فاقہ کرتے ہوئے دن بُجھی بُجھی شامیں
غموں کے بوجھ سے کُچلا ہوا ہر اک کا شباب
یہ کشمکش یہ مسلسل عذاب کی راتیں
قدم قدم پہ سنانیں، نظر نظر پہ عتاب

یہ روٹی روٹی یہ لڑتے ہوئے ہزاروں لوگ
اور ان کے ہاتھوں میں بجتی ہوئی یہ زنجیریں
یہ مفلسی کو بڑھاتے ہوئے حسیں محلات
اجل کے ہاتھ میں یہ زندگی کی تصویریں

حسین کھیتوں سے اٹھتا ہوا دھواں ہی دھواں
یہ چھوٹے چھوٹے گھروں میں دبی دبی آہیں
یہ خاک و خوں سے ابھرتے ہوئے جواں ہی جواں
بغاوتوں کے لیے یہ نئی نئی راہیں ——

ہزار ظلم کی بڑھتی رہی سپاہ تو کیا
کبھی جنونِ جفا سے مگر نہیں ہارا
ہزار راہ میں رکھے ستمگروں نے پہاڑ
مگر رکا نہ کبھی انقلاب کا دھارا

(نا تمام)
علی گڈھ ۵۴ء

غم کدے میں اجنبی

(ایک مکالمہ)

"مرے اُفق پہ ستارے چمک چمک اُٹھے
یہ آج کون مرے غمکدے میں آیا ہے؟

نئی خلش ہے نیا درد ہے نیا غم ہے
یہ کس نے سازِ محبّت پہ گیت گایا ہے؟"

"نظر اُٹھا کے تو دیکھو یہ کون آیا ہے
مسرّتوں کی بہاروں کا رازداں بن کے
نئے چراغ جلاؤ، کچھ اہتمام کرو
کہ آگیا ہے کوئی دل میں مہماں بن کے"

"یہاں چراغ جلیں گے نہ پھول مہکیں گے
یہ غم کدہ ہے شکستِ شباب کا مسکن
نظر ملانے کی فرصت کسے ملی مجھ سے
دلِ تباہ میں ہوتا ہے کون جلوہ فگن؟"

"اٹھو اور اٹھ کے محبّت کا احترام کرو
کہ آگیا ہے کوئی بیخودی کی راہوں سے
حریمِ دل کو سجاؤ نئی امیدوں سے
نگاہِ عشق ملاؤ ذرا نگاہوں سے"

"نہ کوئی بنتِ قمر ہے نہ کوئی حورِ حرم
نہ کوئی حسنِ مجسّم نہ کوئی برق فشاں
مگر یہ پھول سا چہرہ، یہ شبنمی آنکھیں
شگفتگی کا یہ عالم کہ گلستاں کا گماں

یہ ہونٹ شہد میں ڈوبی ہوئی کلی کی طرح
یہ زلف جیسے سیہ بادلوں کا اک طوفاں
قدم قدم پہ جگاتی نئی تمنائیں
کہ جیسے جوش میں آ کر حیات ہو رقصاں
کوئی حسینہ، کوئی مہ جبیں، کوئی پری وش
یہ اجنبی مری دنیا میں آ گئی ہے کہاں"
"یہ آ گئی ہے ترے دل میں زندگی بن کے
بہارِ نو کی مچلتی ہوئی خوشی بن کے"
"نئی خوشی ہی نئے غم کی ابتدا تو نہیں
یہ چند لمحے محبت کی انتہا تو نہیں
یہ مہمان چلا جائے گا تو کیا ہو گا
تڑپ کے دل یونہی رہ جائیگا تو کیا ہو گا؟"

"اس اجنبی کو نیا ہم سفر بنا ڈالو
محبتوں کی نئی رہ گذر بنا ڈالو!"

یہ اجنبی ہی کہیں میری زندگی تو نہیں!
یہ اجنبی ہی کہیں میری زندگی تو نہیں!!"

"کبھی نہ ختم ہوئی داستاں دوانوں کی
رہے گی غم ہی کی سُرخی نئے فسانوں کی"

(بمبئی ۵۵ء)

اُس نے کہا! —

سائے بڑھنے لگے اور جیسے کہیں رات ہوئی
دیر تک بیٹھے رہے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے
پھر دلِ زار نے چپکے سے انھیں چوم لیا
ہونٹ تھرائے کہ کس طرح کی یہ بات ہوئی
پیاری آنکھوں نے کہا ہم تو بہت ہیں مخمورُ
کوئی ناشاد رہے ہم تو ابھی ہیں مسرور
ذہنِ شاعر بھی تخیّل میں ذرا جھوم لیا

— بات اتنی ہی ہوئی تھی کہ وہ آنکھیں بولیں
"بارہا تم نے ہماری ہی قسم کھائی ہے

سچ کہو جرأتِ دل کیسے کہاں پائی ہے
ہم پہ صدقے کیا کرتے ہو دل و جاں لیکن

راز ہیں کون سے پنہاں یہ سمجھتے بھی ہو!
کس طرح تم سے کریں عہد وفا کی باتیں

اجنبی ہوتا ہے مہماں، یہ سمجھتے بھی ہو!
ڈوبنے لگتے ہو جب یاس کی گہرائی میں

بیکسی ہم سے تمہاری نہیں دیکھی جاتی!
جام پہ جام چڑھاتے ہو کہ غم کچھ بھی نہیں

بیخودی ہم سے تمہاری نہیں دیکھی جاتی!
کیوں کہا کرتے ہو دنیا ہے یہ ہم کچھ بھی نہیں

ایسے لمحوں میں بھلا کس نے سنبھالا ہے کہو
غم کدے سے تمہیں کس طرح نکالا ہے کہو!

اپنے سینے میں بھی جذبات کے طوفاں ہیں مگر
ہم تمہاری ہی طرح بے سرو ساماں ہیں مگر
حُسن کے آج ہر اک گام پہ سودائی ہیں
اپنی نظریں بھی تو اب باعثِ رسوائی ہیں"

ذہنِ شاعر نے یہ باتیں بھی سنیں کچھ نہ کہا
ہاتھ خود بڑھ کے نئی طرح سے ہاتھوں سے ملے
آنکھوں آنکھوں میں محبت کی نئی بات ہوئی
سائے بڑھنے لگے اور جیسے کہیں رات ہوئی

(اورنگ آباد ۵۵ء)

اجنتا

کتنے بے نام بت تراشوں نے
سالہا سال کی ریاضت سے
اِن چٹانوں کو زندگی بخشی
کوہساروں کے قلب چاک کئے
بے نشاں رہ گئے فن کو عظمت دی
پتھروں میں بنائے نقش و نگار

ایک طوفاں بدوش دریا میں
کھِل رہے ہیں کنول کے پھول ہی پھول
دُور ساحل پہ جگمگاتے ہیں

مندروں کے سکوں نواز کلس!

گہرے گہرے اندھیرے غاروں میں
بدھ کے پیغام کو جِلا بخشی
مذہبِ عشق کی بِنا ڈالی

(۲)

جانے کس طرح کے مصوّر تھے؟
کون سا رنگ، کیسا جذبہ تھا؟
خونِ دل تھا کہ خونِ ارماں تھا!
کیسے سمجھے تھے پتھروں کی زباں
کون جانے جنوں کا رازِ نہاں
حُسنِ معصوم کی اداؤں کا
ایک اک نقش یوں اُبھار گئے
جیسے زندہ ہوں ساری تصویریں

آج بھی ہونٹ مسکراتے ہیں
عارضوں پر چمک ہے بوسوں کی
زلفِ پیچاں کی چھاؤں میں، دیکھو
جل رہے ہیں دیئے مُرادوں کے
جسم شاداب جیسے اِک گلشن
وصل کی شب کی ساری مدہوشی
حُسن اور عشق کی ہم آغوشی
عشقِ انساں کی ساری تفسیریں
ظلمتوں میں اُبھرتی تنویریں
خواب اور خواب کی یہ تعبیریں
ہے تقدس کی داستانِ قدیم
ارتقاء کا یہ کاروانِ عظیم
عظمتِ فن کے لالہ زاروں کی
یادگاریں ہیں یہ بہاروں کی

(۳۰)

کتنی حیرت سے، کتنی حسرت سے
دیکھتے ہیں ہر ایک نقش و نگار
ہم اجنتا میں اجنبی تو نہیں
کیوں خیال آ رہا ہے رہ رہ کر
کتنے فن کار اب بھی زندہ ہیں
جن کے تیشوں کی ایک ضرب سے
کوہساروں کے دل دھڑکتے ہیں

شہروں شہروں میں قریے قریے میں
شاہراہوں پہ، کوچے کوچے میں
جشنِ تعمیر کی ہے تیّاری
اک نئے دَور کی ہے بیداری

صبح ہونے دو دل یہ کہتا ہے
"ہم اجنتا نئی بنائیں گے
حسن کو فن کی عظمتیں دے کر
عشق کو غم کی وسعتیں دے کر
ناتوانوں کو ہمتیں دے کر
کامگاروں کو جرأتیں دے کر
پھر سے اپنے وطن کے ایواں کو
اک نئے رنگ سے سجائیں گے
ہم اجنتا نئی بنائیں گے"

(اورنگ آباد ۵۵ء)

شہرِ آرزو

چاند ہے سمندر ہے اور دل دھڑکتا ہے
جیسے کِھلنے والا ہے آرزو کا اِک غنچہ
مہکی مہکی خوشبو ہے ہر طرف ہواؤں میں
دُور آسمانوں میں میرے خواب کی دُنیا
انتظار میں اب تک کروٹیں بدلتی ہے
کون آنے والا ہے کون آنے والا ہے

چاند ہے سمندر ہے اور دل دھڑکتا ہے
بیکسی کے عالم میں سوچتا ہوں کیا ہوگا؟

دُور جگمگاتا ہے شہر اِک اُمیدوں کا
جس کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے ارماں
میرے غم کو کیا سمجھے کون ہے یہاں اپنا
دل مگر دھڑکتا ہے کون آنے والا ہے؟

شہر یہ اُمیدوں کا، اِک عجیب دنیا ہے
جس میں حسرتیں اکثر خواب بن کے ملتی ہیں
اور اجنبی آنکھیں داستاں سُناتی ہیں
"ہم کہاں تمہارے ہیں پھر بھی ہم تمہارے ہیں
راز یہ نہ سمجھو گے کون تم کو سمجھائے؟
کس کے منتظر ہو تم، کون تم کو اپنائے"
دل مرا دھڑکتا ہے کون آنے والا ہے

شہر یہ اُمیدوں کا اِک طلسم خانہ ہے

جس کا ایک اِک لمحہ قیمتوں میں ڈھلتا ہے

قہقہوں کی قیمت ہے، آنسوؤں کی قیمت ہے

سیم و زر کی دنیا ہے ہر بشر کی قیمت ہے

گیت بیچنے والے خود کو بیچ بیٹھے ہیں

میں بھی ایک شاعر ہوں سوچتا ہوں کیا ہوگا

دل مگر دھڑکتا ہے کون آنے والا ہے؟

شہر یہ امیدوں کا میرے دل کا مرکز ہے

اس کی چوڑی سڑکوں پر اس کی تنگ گلیوں میں

کتنے گیت گائے ہیں کتنے غم اٹھائے ہیں

یہ بہت ہی ظالم ہے یہ بہت ہی پیارا ہے

بے وفا سہی لیکن پھر بھی اِک سہارا ہے

چپکے چپکے آئے گا کون زندگی لے کر؟
آہٹیں تو ملتی ہیں دل مرا دھڑکتا ہے
کون آنے والا ہے؟ کون آنے والا ہے؟

چاند ہے سمندر ہے شورِ نالۂ دل ہے
بے بسی کے عالم میں سوچتا ہوں کیا ہوگا؟
ہلکی ہلکی خوشبو ہے آرزو کے پھولوں کی
چاندنی میں رقصاں ہے میرے خواب کی دنیا
جانے کیسے آئے گی انقلاب کی دنیا؟
شہر یہ امیدوں کا اب بھی جگمگاتا ہے
کون آنے والا ہے؟ کون آنے والا ہے؟

(بمبئی ۵۶ء)

چند آنسو، آرزو کی راکھ، ٹوٹا دل کا جام
ہیں یہی اب غم کدے میں میکشی کی یادگار

زرد پتّے، پھول مرجھائے ہوئے دامن میں ہیں
فصلِ گل نے دی ہیں یہ عاشقی کی یادگار

کون سا عالم تھا کچھ بھی یاد اب آتا نہیں
چند نظمیں رہ گئیں دیوانگی کی یادگار

صبرِ بے پایاں کی، عزمِ کامراں کی ہے قسم
بن ہی جائے گی ہماری زندگی کی یادگار

(بمبئی ۱۹۵۸ء)

حادثہ

ٹھوکریں کھاتے تھے لیکن حادثہ ایسا نہ تھا
غم بہت تھے اس جہاں میں سانحہ ایسا نہ تھا
زندگی تھی تشنگی کی ایک مسلسل داستاں
سن کے چپ ہو جاؤں کوئی واقعہ ایسا نہ تھا

کیسے دیوانہ بنا ہرگز نہ تھا مجھ کو گماں
تھا عجب سیلابِ غم اشکِ محبت میں نہاں

عشق گر سرمایۂ ہستی نہیں تو کچھ نہیں
اس خرابے میں جو یہ بستی نہیں تو کچھ نہیں

ہیں نشے لاکھوں جہاں میں اپنا اپنا ذوق ہے
اہلِ دل کو عشق کی مستی نہیں تو کچھ نہیں

کوئی پوچھے یا نہ پوچھے شب کے سنّاٹے میں دل
ٹوٹتے تاروں سے کہتا ہے پرانی داستاں

ٹھوکریں کھاتے تھے لیکن حادثہ ایسا نہ تھا
غم بہت تھے اس جہاں میں سانحہ ایسا نہ تھا

بمبئی ۵۸ء

یہ بات نہ تھی

باتیں ہوتی تھیں مگر پہلے تو یہ بات نہ تھی
رو لیا کرتے تھے اس طرح کی برسات نہ تھی

ہیں وہ آوارہ جسے راس نہ آیا صحرا
آبلہ پائی نے گلزار کھلائے ہیں کئی
گمرہی سے بھی کبھی کم نہ ہوا ذوقِ سفر
رہنما راہ میں بھٹکے ہوئے پائے ہیں کئی

دل تڑپتا تھا مگر اس کی مدارات نہ تھی
تجھ سے ملتے تھے مگر ایسی ملاقات نہ تھی

ایک لمحے کو یہ سمجھے تھے حسیں ہے دنیا
تیری نظروں کے تصدق سے ملا تھا وہ فسوں
کہ ہر اک ذرّے میں اک مہرِ مبیں ہے دنیا
تیرے "غمگین تبسم" سے ملا تھا وہ سکوں

نور ہی نور تھا بے خواب سہی یہ رات نہ تھی
رو لیا کرتے تھے اس طرح کی برسات نہ تھی

چند لمحوں نے بدل ڈالا ہے عالم سارا

بمبئی ۵۶ء

پچھتاوا

اُن سے کر کے پیار کی جرأت، ہم کتنا پچھتاتے ہیں؟
کب کم ہو گا جذبۂ وحشت، ہم کتنا پچھتاتے ہیں؟
اُن سے تیری نبھ نہ سکے گی، ہم نے کتنا سمجھایا تھا
اے دل تو نے کی ہے بغاوت، ہم کتنا پچھتاتے ہیں؟
خاموشی کی آگ میں جل کر خاک میں تجھ کو مل جانا تھا
تو نے کیوں کی اُن سے شکایت، ہم کتنا پچھتاتے ہیں؟
اُن سے تیرا رشتہ کیسا، بیگانہ ہے اپنا کیسا
آخر کیوں کی تو نے محبت، ہم کتنا پچھتاتے ہیں؟

دل یہ تڑپ کر ہم سے بولا "کیوں ناحق پچھتاتے ہیں
جینا ان کے نام سے سیکھا، خوب ہمیں بہلاتے ہیں
جانِ سخن سے ترکِ محبت، کیسی باتیں کرتے ہیں
پچھتاوے سے کیا حاصل ہے ہم تو جی سے گذرتے ہیں"

سوچ رہے ہیں اب کیا ہوگا سودائی سے کون ملے گا؟
سوچ رہے ہیں اب کیا ہوگا سودائی سے کون ملے گا؟

(بمبئی سـ۵۶ء)

قیدی

عشق کے جرم میں مدت سے گرفتار ہوں میں
اب تو خود اپنے لئے باعثِ آزار ہوں میں

بارہا دل کو بڑے عجز سے سمجھایا ہے
"تیرے کوچے سے کہیں اور چلیں ہم دونوں
یونہی جل جل کے یہاں خاک میں ملنا ہے اگر
کیوں نہ پھر آتشِ دوراں میں جلیں ہم دونوں"

دل نے اک شام بھی مانی جو مری بات کبھی
اُٹھ کے چپکے سے چلا آیا ہوں میخانے میں
ہائے جی بھر کے نہیں پی تھی کہ جانے کیسے
تیری صورت نظر آئی مرے پیمانے میں

وہی پیشانی، وہی ہونٹ، وہی آنکھوں میں
مجھ کو ہر طرح سے دیوانہ بنانے کا غرور
شمع کی طرح نکلتی ہوئی چہرے سے لویں
دلِ بیتاب کو پروانہ بنانے کا غرور

بیخودی نے ترے ہونٹوں کو جو چھونا چاہا
جام تھرا کے گرا ٹوٹ گیا خوابِ حسیں
پھر وہی ضد وہی باتیں، وہی بانے کی لگن
جانے یہ کس نے مرے دل کو دلایا ہے یقیں

تو بھی قیدی ہے تجھے اس کی خبر ہے کہ نہیں
تیرے ہاتھوں میں روایات کی زنجیریں ہیں
تو بھی آزاد رہے میں بھی ترے ساتھ رہوں
زندگانی کو بدلنے کی بھی تدبیریں ہیں

آ بھی جا تو کہ ابھی جوشِ جنوں زندہ ہے
ایک تارہ افقِ عشق پہ تابندہ ہے

(بمبئی ۱۹۵۶ء)

نوید

اس درجہ ہیں مضطرب نگاہیں
جیسے کہ سکوں نہ مل سکے گا
خاموشی سے تک رہی ہیں راہیں
کب گذرے گا کارواں تمہارا؟
کس طرح تمہیں خبر ملے گی
بیتابیٔ دل کا کیا سہارا

(۲)

یہ عشق ہے ابتدائے ہستی
انجام سے کیوں ہو تم ہراساں
شوریدہ سری سہی، سنو تو
جس سے کہ بدل سکے یہ دنیا
پھر ایسا نہ اُٹھ سکے گا طوفاں
دل لاکھ تڑپ تڑپ کے مچلے
پورا نہیں ہو گا کوئی ارماں
آجاؤ کہ پھر نہ آسکے گا
یہ غم ہے نویدِ صد بہاراں

بمبئی ۵۶ء

نئی بات

کس طرح ہوگی ملاقات بڑی مشکل ہے؟
کاٹے کٹتی نہیں یہ رات بڑی مشکل ہے؟
تم اسی شہر میں ہو دل کو خبر ہے اس کی
صبر کی کون کرے بات بڑی مشکل ہے؟

کتنی راتیں یونہی سڑکوں پہ گذاریں ہم نے
کہ کبھی ملنے کا پیدا کوئی امکاں ہوگا!
لوٹ کے آئے ہو تم آج ہی، بولو تو ذرا
کون اس رات بھلا جانِ شبستاں ہوگا؟

ہم اسی طرح سے محروم رہیں گے کب تک
کیا کبھی اپنا بھی پورا کوئی ارماں ہوگا؟
کیا نئی طرح جلائیں گے امیدوں کے دیئے
یا پھر اشکوں سے اُسی طرح چراغاں ہوگا؟
تم نے خود جن کو بنا رکھا ہے بے نام خدا
دل تمہارا بھی بہت اُن سے پریشاں ہوگا!
توڑ دو بڑھ کے یہ زنجیرِ وفا، عہدِ کہن
پھر یہ شاعر بھی نئی طرح غزلخواں ہوگا

کیا کرے کوئی مناجات، بڑی مشکل ہے؟
تم نہ سمجھو گے نئی بات، بڑی مشکل ہے؟

(بمبئی ۵۶ء)

ہمارے بعد

یہ راہیں خود بخود پوچھیں گی تم سے
کہاں تم جاؤ گے جب ہم نہ ہوں گے؟
اشارے کون سمجھے گا تمہارے
کسے سمجھاؤ گے جب ہم نہ ہوں گے؟
ابھی اشکوں میں پنہاں ہے تبسّم
خوشی کیا پاؤ گے جب ہم نہ ہوں گے؟
زمانہ توڑ دے گا شیشۂ دل
بہت گھبراؤ گے جب ہم نہ ہوں گے؟
تغافل کی سزا تم کو ملے گی
بہت پچھتاؤ گے جب ہم نہ ہوں گے؟

(بمبئی ۱۹۵۶ء)

آخری نظم

اِتنا رو لیں کہ ہمیں کوئی شکایت نہ رہے
کیسے کہہ دیں کہ زمانے میں محبت نہ رہے
صُبح ہو گی مگر اے دل تجھے معلوم نہیں
کل سے شاید تری باتوں میں حلاوت نہ رہے
اے جنوں! تجھ سے جدا ہونے کی ساعت آئی
"موت" کہتی ہے کہ اب عشق کی وحشت نہ رہے
غیر ممکن ہے مگر صبر کی کوشش تو کریں
ہائے ایسا نہ ہو پھر صبر کی طاقت نہ رہے

جانی بوجھی ہوئی راہوں سے نہ گذریں گے مگر
کیسے ممکن ہے کہ "جلنے" کی بھی حسرت نہ رہے
لاکھ چاہیں گے مگر ختم نہ ہوگی کل سے
کاش! کھوئے ہوئے رہنے کی یہ عادت نہ رہے

(۲)

گر کوئی پوچھے گا اس درجہ پریشان ہیں کیوں
ہنس کے کس طرح کہیں گے کہ کوئی بات نہیں
آئیں گی صبحیں بھی، راتیں بھی، نہ جانے کتنی
تم سے ملنے کی کوئی صبح، کوئی رات نہیں
دل پہ چھائے ہی رہے گی یہ المناک گھٹا
صرف رونے کے لئے موسم برسات نہیں

کش مکش ختم ہوئی پھر بھی یہ کیا بات ہوئی
کوئی جیتا بھی نہیں، اور کوئی مات نہیں
خواب میں آ کے ٹڑھا جاؤ گے بیتابیٔ دل
یہ تو کہنے کو نہ ہوگا کہ ملاقات نہیں
آخری نظم تمہیں آج سناتے جائیں
اور تو پاس ہمارے کوئی سوغات نہیں

رخصت اے عشق کہ ہم دہر میں ناشاد رہے!
تیرا مے خانہ ہمیشہ یونہی آباد رہے!!

(بمبئی ۳۱ جنوری ۵۷ء)

اس کشمکش کے دور میں اے دل تجھے ملی
ناکامیوں کے بعد محبت کی آرزو!
کتنا بجھائے کوئی نہ بجھ پائے گی کبھی
روشن رہے گی دل میں بغاوت کی آرزو!
ہر صبح سامنا ہو حقیقت کا، غم نہیں
ہر شام ہو گی ہم کو حکایت کی آرزو!
مانا کہ حسرتوں کے سوا کچھ نہ پائیں گے
کرتے رہیں گے پھر بھی مسرت کی آرزو!

بمبئی ۱۷ر جون ۵۷ء

میرا عہدِ شباب

کون آئے گا ہر اک لمحہ صدا آتی ہے
پھر نئی طرح دھڑکتا ہے دلِ خانہ خراب؟
کون چھیڑے گا بڑے ناز سے ان تاروں کو
کیوں لرزتا ہے شکستہ سا محبّت کا رباب؟
جس کے ہر لفظ میں تفسیرِ غمِ پنہاں ہو
کون لکھے گا نئے دَور میں اک ایسی کتاب؟
بھوک میں، پیاس میں بیتابی و بیخوابی میں
کون دے گا مرے غمناک سوالوں کے جواب؟
کون پوچھے گا بھلا مجھ سے دوانے کو یہاں
حسرتیں جس کے لئے بن گئیں اُمید کے خواب؟

دھوپ میں تپتی ہے مدت سے مری کشتِ حیات

خواب کی طرح سے اڑتے چلے جاتے ہیں سحاب!

دیکھئے دور سے دریا کی چمکتی موجیں

جائیے پاس تو ملتا ہے وہی ایک سراب!

کوئی دنیا میں کسی کا نہیں، معلوم ہے یہ

پھر بھی اے کاش پلا دے مجھے کوئی زہراب!

کیا ملے گا نہ مجھے جہدِ مسلسل کا صلہ

کیا نہ آئے گا کبھی دہر میں وہ روزِ حساب؟

کون ہے کون ہے یہ کیسی صدا آتی ہے

دل دھڑکتا ہے کہ روتا ہے مرا عہدِ شباب

کس طرح گذرے گی یہ عمر، خدا ہی جانے!

ہائے وہ دن ہوں کہ مل جائے سرِ شام شراب

(بمبئی ۵۷ء)

ایک کہانی ایک سوال

(ایک ننھی منی لڑکی کے نام)

آؤ تمھیں ہم آج سنائیں
ایک کہانی، ایک سوال!
شاید تم نے دیکھا ہو گا
حرفوں کا پھیلا اک جال
اِن حرفوں سے لفظ بنا کر
شعر بنانا بھی ہے کمال
ہم بھی اِک شاعر سے ملے تھے
آج سنو کچھ اس کا حال!

آنکھیں وحشت کی ماری تھیں
میلے کپڑے حال ٹڈھال

اشکوں کی مے پیتے رہنا
فاقے کرنا ایک کمال

بلّی آپا نے یہ بتایا
دیوانہ تھا، پچھلے سال

غزلیں، نظمیں، گیت سہانے
لئے پھرا وہ اپنا مال

کون خریدے ایسی چیزیں
پڑا ہو جب الفت کا کال

ہم نے خود ہی اس سے پوچھا
کیوں ہے تیرا ایسا حال

ہنس کر وہ دیوانہ بولا

"جینا کیوں ہے ایک وبال؟

دیوانہ ہوں شاعر بن کر

ورنہ ہوتا مالا مال

میں کوئی بیوپار جو کرتا

ہوتا ایک بڑا دلّال

لیکن دل کی دھڑکن میں ہیں

لاکھ حقائق لاکھ خیال

مجھ کو اتنا تو بتلاؤ

بن جاؤں کیسے حمّال

ملک یہ کیسا ہے سمجھاؤ

شاعر ہیں جس میں کنگال

پریم کی میں نے بھیک جو مانگی

کہتے ہیں الٹا ہے سوال

سنتا ہوں دنیا بدلے گی

چمکے گا انساں کا جمال

جانے وہ دن کب آئے گا

جینا تو ہے آج محال

سوچ رہا ہوں ڈوب مروں اب

بھرے پڑے ہیں کتنے تال

لیکن میں اک بات کہوں گا

ہے یہ اک آسان سوال

شاعر کا دل ٹوٹ نہ جائے

کیا اتنا رکھو گے خیال؟"

اتنا کہہ کر چلا گیا وہ

بھول ہوا آخر پامال

(بمبئی ۵۷ء)

ہم لوگ

رات کو آخری شب جان کے سو جاتے ہیں
صبح کو اُٹھ کے نئی صبح کہا کرتے ہیں
کوئی ہو سب سے محبّت سے ملے ہیں اب تک
زہر کا جام بھی ہنس ہنس کے پیا کرتے ہیں
کوئی پاگل کبھی کہتا ہے تو چپ رہتے ہیں
ہنسنے والوں پہ مگر ہم بھی ہنسا کرتے ہیں
رونے والوں سے بڑے درد سے یہ کہتے ہیں
زخم اس طرح کہیں دل کے بھرا کرتے ہیں

کبھی مغرور حسینوں سے اُلجھ پڑتے ہیں
خود رقیبوں سے کبھی بڑھ کے ملا کرتے ہیں
لاکھ باغی ہیں مگر رسمِ محبّت کی قسم
اُٹھ کے ہم پچھلے پہر دل سے دعا کرتے ہیں
دلفریبی کی یہ باتیں، یہ لگاوٹ کے خیال
کتنے افسانوں کے عنوان بنا کرتے ہیں
حال میں رہ کے بھی فردا کی خبر رکھتے ہیں
کون کہتا ہے کہ یادوں میں رہا کرتے ہیں
صبر کرتے ہیں صداقت کو سمجھنے کے لئے
زندگی یوں بھی بسر اہلِ وفا کرتے ہیں
ہم لگاتے ہیں کبھی تلخ حقائق کا سُراغ
اپنے قصے کبھی غیروں سے سنا کرتے ہیں
کبھی چھپ جاتے ہیں تاریکی میں رسوا ہو کر
کبھی محفل میں چراغاں بھی کیا کرتے ہیں

جمع کرتے ہوئے اشکوں کو کبھی پھولوں کو
شہر در شہر اسی طرح پھرا کرتے ہیں
دل شکن، صبر طلب، سخت مراحل میں بھی ہم
آتشِ غم کے سہارے سے جیا کرتے ہیں
ساتھ ہیں کشمکش زیست کے، ہر منزل پر
ہر نئے موڑ پہ آواز دیا کرتے ہیں
دل پہ جو نقش ہیں، جو ذہن میں تصویریں ہیں
اک مصوّر کی طرح ان کو لکھا کرتے ہیں

آئینہ خانے میں حیران کہاں ہیں ہم لوگ
آج کے دَور کی خاموش زباں ہیں ہم لوگ
(بمبئی ۵۷ء)

"شہرِ آرزو" میں کتابت اور طباعت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ میں شاعر اور پڑھنے والوں سے اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ تصیحح کر لیجئے۔

ناشر

صفحہ		صحیح	غلط
۷۳	آخری شعر کے آخری مصرعے میں	پہ	پر
۸۶	آٹھویں مصرعے میں	بے بصری	بے خبری
۹۲	چوتھے مصرعے میں	پلتی	چلتی
۹۴	پہلے مصرعے میں	دھڑکنیں	دھڑ میں
۱۰۰	تیسرے مصرعے میں	بھی	میں
۱۰۷	دوسرے اور چوتھے مصرعے میں	کردو	نہ کر
۱۲۱	پہلے مصرعے میں	تجھے	انھیں
۱۴۵		۱۴۵	۱۲۵
۱۳۳	پانچویں مصرع میں	پیاسی	پیاری
۱۴۶	تیسرے مصرعے میں	اک	ایک
۱۶۱	نویں مصرعے میں	چھائی	چھائے

نئی کتابیں

گوشۂ ادب ایک خالص ادبی ادارہ ہے۔ شہر آرزو
اس ادارے کی پہلی پیش کش ہے۔

باقر مہدی کی کتابیں سلسلہ وار شائع کی جائینگی، ہر کتاب
چند ماہ کے وقفہ کے بعد شائع ہوتی رہے گی۔

۲- فن کار اور سماج

باقر مہدی کے منتخب تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس میں حق گوئی اور بیباکی
کے ساتھ اعلیٰ ادبی معیار پر تنقیدی بحثیں ہیں۔

جدید عمرانی نقطہ نظر سے ادب، سماج، فن کار اور زندگی کے اقدار اور
رشتوں کی پرکھ ہے۔

اس مجموعے میں جدید شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں پر
تفصیلی مضامین ہیں جو ان کی تخلیقات کے جائزے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے
مرتبے متعین کرتے ہیں۔

قیمت ۴/۸

۳۔ فالتو آدمی

باقر مہدی کے منتخب ڈراموں کا مجموعہ

یہ ڈرامے، بمبئی، حیدر آباد، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد اور سیلون سے متعدد بار نشر ہو چکے ہیں۔ اس میں ہند و پاک کے مشہور ڈرامہ نگار مرزا ادیب کا دیباچہ بھی شامل ہوگا۔

قیمت :- ۲/۴

۴۔ اردو سوانح نگاری کی مختصر تاریخ و تنقید

سوانح نگاری کا فن کیا ہے؟

اردو کی سب سے اچھی سوانح عمری کون سی ہے؟

یہ اور دوسرے اس صنفِ ادب سے متعلق سوالات کے فکر خیز جوابات کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

باقر مہدی کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

قیمت ۵/۴

ناشر
خلیل احمد خاں
گوشۂ ادب - ۲۱ - ارکیڈیا بلڈنگ بمبئی ۸

کاتب
سلامت رضوی

پرنٹر
اے، کے، محمد
قادری پریس، محمد علی روڈ
بمبئی ۳

باقر مہدی

مصنف

ناشر

اردو شاعری